# خلاصہ

# فسانۂ آزاد میں لکھنوی تہذیب کے عناصر

مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈگری


مقالہ نگار

**طلعت سلطانہ**

ریسرچ اسکالر

شعبۂ اردو

نگراں

**ڈاکٹر خورشید الاسلام**

پروفیسر شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ


سنہ ۱۹۸۱ء

# فسانۂ آزاد میں لکھنوی تہذیب کے عناصر

مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈگری


مقالہ نگار

**طلعت سلطانہ**

ریسرچ اسکالر

شعبۂ اُردو

نگرانی

**ڈاکٹر خورشید الاسلام**

پروفیسر شعبۂ اُردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ


سنہ ۱۹۸۱ء

T2412

## خلاصہ

ہندوستان مین بعض شہر ایسے تھے جو دور و نزدیک کے رہنے والون کی تہذیب و ثقافت کے امین تھے ۔ لکھنؤ بھی انہی شہرون مین سے ایک تھا۔ یہ شہر نواب آصف الدّولہ کے زمانہ سے ہی شعر و ادب اور فنونِ لطیفہ کا مرکز بن گیا تھا ۔ اس کے بعد نوابین اودھ اور امرائے لکھنؤ نے جی کھول کر شعر و ادب اور فنون لطیفہ کی سرپرستی کی ۔ یہان تک کہ واجد علی شاہ کے زمانہ مین یہ سرپرستی اپنے معراجِ کمال پر پہنچ گئی ۔ یہان کے رہنے والون نے زندگی کے ہر شعبہ مین نئی راہین نکالین اور رفتہ رفتہ یہ شہر اپنی مخصوص تہذیب و ثقافت کے لئے سارے ہندوستان مین مشہور ہو گیا ۔

انیسوین صدی کے نصف آخر مین اس کلچر کی بڑی اچھی عکاسی فسانہ آزاد مین ہوئی ہے یون تو لکھنؤ کی تہذیبی زندگی کے بارے مین شرر کی مستند کتاب " گزشتہ لکھنؤ " موجود ہے ۔ اس کے علاوہ میر حسن ۔ میر تقی میر ۔ نسیم اور شوق لکھنوی کی مثنویون مین بھی اس تہذیب کی جھلکیان ملتی ہین ۔ سرشار ۔ رجب علی بیگ سرور ۔ اور مرزا رسوا کی نثری تصانیف مین بھی اس کے بڑے اچھے نمونے ملتے ہین ۔ لیکن ان سب مین فسانہ آزاد چونکہ سب سے زیادہ طویل اور ضخیم تصنیف ہے اس لئے فطری طور پر اس مین لکھنوی تہذیب کے سب سے زیادہ تفصیلی خاکے ملتے ہین ۔

فسانہ آزاد ہفت روزہ اودھ اخبار میں قسط وار شائع ہوا ۔ اس کی پہلی قسط دسمبر ۱۸۷۸ء میں شائع ہوئی اور آخر دسمبر ۱۸۷۹ء میں گویا نثری ادب کا یہ شاندار قصر ایک سال میں تیار ہوا ۔ اس کے اس کو کتابی شکل میں شائع کیا گیا ۔ فسانہ آزاد میں لکھنؤ اپنی پوری شان و شوکت نیز زوال پذیر عناصر کے ساتھ جلوہ گر ہے ۔ اس کتاب میں واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد اس تہذیب کے نشیب و فراز کی جزئیات تک ملتی ہیں ۔ ابھی تک اس پہلو پر توجہ نہیں دی گئی تھی ۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ اس مرحوم تہذیب کے عناصر کی چھان بین کر کے انھیں پیش کیا جائے ۔

مقدمہ میں ہم نے ہندوستان کے سیاسی ۔ سماجی اور ادبی مناظر میں حکومت اودھ کا جائزہ لیا ہے اور فسانہ آزاد میں سرشار نے لکھنؤ کی سوسائٹی کو جس طرح پیش کیا ہے اس کا مختصر ذکر کیا ہے اور فسانہ آزاد کی تہذیبی اہمیت کی طرف پہلی بار توجہ دلائی ہے ۔

پہلے باب میں نہ صرف یہ کہ لکھنؤ کی مختصر تاریخ پیش کی گئی ہے بلکہ لکھنؤ سے فیض آباد کا جو علاقہ تھا اسے بھی واضح کیا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ سلطنت اودھ کا قیام کب عمل میں آیا ۔ کس طرح فیض آباد آباد ہوا ۔ کب اس کو ترقی ملی اور کہاں کہاں سے فنکار آکر یہاں جمع ہوئے ۔ بادشاہوں نے کون کون سے کارنامے انجام دیئے اور اودھ کو کب ترقی ملی ۔

دوسرے باب میں شاہانِ اودھ کا طرزِ معاشرت اور ان کی تہذیبی دلچسپیوں کی نشان دہی کی گئی ہے ۔ اس میں امراء و نوابین اور ان کے لواحقین

کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ نوابوں اور امیروں کے مزاج کچھ اس قسم کے تھے کہ دربار میں اور ہر خاص و عام محفل میں مصاحبین کا وجود لازمی تھا اس لئے ایسی محفلوں کا بھی ذکر کیا ہے ۔ جن میں خاص و عام دونوں اپنی اپنی تفریحات میں مشغول نظر آتے ہیں ۔ نوابین اودھ اور عمائدین لکھنؤ میں اکثر کو درندوں کی لڑائی سے بھی دلچسپی تھی ۔ شیروں کو آپس میں خوب لڑاتے تھے ۔ اکثر شیروں کو تیندوں سے بھی لڑایا جاتا تھا ۔ نصیر الدّین حیدر کے زمانے میں ایک بار شیر کو گھوڑے سے بھی لڑایا گیا تھا جس میں میدان گھوڑے کے ہاتھ رہا تھا ۔ نوابین اور اُمراء کے علاوہ متوسط طبقے کے لوگوں کو بھی کبوتر بازی، مرغ بازی، بٹیر بازی، پتنگ بازی کے شوق تھے ۔ جن کو ان لوگوں نے معراجِ کمال تک پہنچا دیا تھا ۔ پھر اہلِ لکھنؤ تیراکی کے بھی شوقین تھے اور تیراکی کا بڑا زبردست میلہ ہوتا تھا ۔ اس کے علاوہ شکار کا بھی شوق رکھتے تھے ۔ تاش، شطرنج وغیرہ کے بھی رسیا تھے ۔ ان تمام باتوں کا ذکر کیا گیا ہے ۔ لکھنؤ کے لوگوں کو موسیقی اور فنِ موسیقی سے بھی بےحد لگاؤ تھا ۔ جان عالم کے زمانے میں تو یہ فن حد کمال کو پہونچ گیا تھا یہاں تک کہ اسے عزاداری کی محفلوں میں بھی بار حاصل تھا ۔ لکھنؤ کے آدابِ زندگی کو سمجھنے کے لئے ان چیزوں کے علاوہ ملبوسات، رہن سہن، ماکولات و مشروبات کا بھی ذکر کیا گیا ہے ۔ چونکہ لکھنؤ کے عہد شباب میں دولت کی فراوانی تھی ۔ اور عشرت کا دور دورہ اس لئے محرم اور عزاداری کی محفلیں زور و شور

سے منائی جاتی تھین ۔ ان تمام باتون کا ذکر ہے ۔ اسی کے ساتھ اس کا بھی جائزہ لیا گیا ہے ۔ کہ اس ذیل مین اہلِ لکھنؤ کی جدّت پسند طبیعتون نے کیا کیا اختراعات کی تھین ۔ یہ کہنے کی ضرورت نہین کہ فسانہ آزاد کا لکھنؤ شعر و ادب کا گہوارہ رہا ہے ۔ اس دبستان ادب نے تاریخ ادب مین کتنے ہی ابواب کا اِضافہ کیا ہے ۔ یہی اثرات تھے جنھون نے سارے لکھنؤ کو اس قدر شعر و شاعری کا دلدادہ بنا دیا تھا کہ پورے شہر مین مجنون کی پسلیان اور لیلی کی انگلیان جیسی آوازین گونجا کرتی تھین ۔

تیسرے باب مین طوائف اور اس کی زندگی کو پیش کیا ہے ۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دکھایا ہے کہ طوائف سے ہر خاص و عام کو کتنی دلچسپی تھی کیونکہ عمائدین لکھنؤ کی زندگی کا ایک اہم جز طوائف تھی ان ان کی دیکھا دیکھی لکھنؤ کے عام لوگ بھی ان سے ربط رکھنا باعث افتخار سمجھتے تھے ۔ یہ طوائفین حاضر جواب ہوتین علم مجلس اور آدابِ بزم سے خوب واقف ہوتین موقع و محل کے مطابق رقص و موسیقی سے مہمانون کی تواضع کرتین ۔ اپنے گھرون کو صاف اور سجا کر رکھتی تھین ۔ مکانون کے ساتھ خود کو بھی فیشن کے مطابق لباس اور زیورات سے آراستہ کرتی تھین ۔ اسی لئے اہلِ لکھنؤ اپنے بچّون کو بھی تہذیب و اخلاق سکھانے کے لئے طوائفون کے یہان بھیجتے تھے ۔ اسی ایک طرز عمل سے ان کے گھرون کے معیار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ اس باب مین لکھنؤ کی اسی تہذیبی زندگی کے اہم پہلو کو اُجاگر کیا گیا ہے ۔

چوتھے باب میں لکھنؤ کے میلوں ٹھیلوں کا ذکر ہے ۔ اور وہاں کی رسومات کو پیش کیا گیا ہے ۔ چونکہ لکھنوی تہذیب پر کوئی گفتگو اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک لکھنؤ کے میلوں ٹھیلوں اور رسموں کا ذکر نہ کیا جائے ۔ اس ذکر کے ساتھ لکھنؤ کے میلوں کی تہذیبی اہمیت سے بھی بحث کی گئی ہے ۔ اس ذیل میں جھڑیوں کے میلے، عیش باغ کے میلے، اٹھوں کے میلے، قیصر باغ کے میلے، گھیوں کے میلے اور دوسرے میلوں کا ذکر ہے ۔ اور جیسا پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے کہ دولت کی فراوانی تھی اسی لئے یہ میلے بھی بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے تھے ۔ ان میلوں کے علاوہ گھریلو رسوم و روایات کا ذکر ہے مثلاً چھٹی، دودھ بڑھائی، ختنہ، عقیقہ، کھیر چٹائی، شادی بیاہ اور غمی جیسی تقاریب اور رسومات جن سے لکھنؤ کی تہذیب عبارت تھی یہ رسوم بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی تھیں ۔ اور ان تمام باتوں پر جس قدر پیسہ صرف کیا جاتا تھا اس پر روشنی ڈالی ہے ۔

پانچویں باب میں لکھنؤ کی صنعت و حرفت کا ذکر ہے ۔ صنعت و حرفت کے میدان کو بھی اہل لکھنؤ کے لطافت مذاق اور رعنائی خیال نے ایک نیا رخ دے دیا تھا ۔ یہاں بھی ان کی جدت پسند طبائع نے اختراعات و ایجادات کی ایک انوکھی دنیا تعمیر کر دی تھی ۔ اس سلسلے میں اہلِ لکھنؤ نے لباس اور زیورات پر خاص توجہ دی تھی لباس اور زیورات کے علاوہ مٹی کے برتنوں میں لکھنؤ کی صراحیاں، آبخورے، حقے، کھلونے اور مورتیاں بھی اپنی

خوبصورتی اور صفائی مین کوئی جواب نہ رکھتی تھین ۔ ان سب کا کہین تفصیل سے اور کہین مجمل ذکر کیا گیا ہے ۔

ارسطو نے بوطیقا مین کہا ہے کہ ادب تاریخ سے زیادہ فلسفیانہ ہوتا ہے ۔ تاریخ حقائق کا بیان کرتی ہے اور ادب صداقت کو پیش کرتا ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی قوم کی ذہنی روحانی اور مادی زندگی کی مکمل تاریخ اس قوم کے ادب پارون سے مرتب کی جا سکتی ہے ۔ ہم نے فسانہ آزاد کے مطالعہ کی روشنی مین ایک جغرافیائی طور پر محدود لیکن تاریخی اعتبار سے دلکش دور فکر کو برانگیختہ کرنے والی تہذیب کو پیش کیا ہے ۔ تاریخی کتابون کے حوالے صرف اس جگہ دیئے ہین ۔جہان وہ فسانہ آزاد کی تائید یا توضیح کے لئے از بس ضروری تھے ۔ ہمارے خیال مین یہ ایک ایسی کوشش ہے جس سے ادب کی معنویت اور تاریخ سے اس کا رشتہ واضح ہو جاتا ہے اور لکھنوی تہذیب کی زندہ اور متحرک تصویر سامنے آجاتی ہے ۔

---

T2412

# " فسانہ آزاد میں لکھنوی تہذیب کے عناصر "

## " ترتیب "


مقدمہ - ص

۱۔لکھنئو کی مختصر تاریخ - ص 31

شاہان اودھ کا طرز معاشرت اور انکی تہذیبی دلچسپیان -

فیض آباد

لکھنئو

نواب سعادت علی خان برہان الملک

مرزا مقیم ابوالمنصور بہادر صفدر جنگ

جلال الدّین حیدر نواب شجاع الدّولہ بہادر

مرزا امانی نواب آصف الدّولہ بہادر

وزیر علی خان آصف جاہ

یمن الدّولہ نواب سعادت علی خان

واجد علی شاہ

۲ ۔فسانہ آزاد مین اعلیٰ - متوسط اور نچلے طبقہ کی زندگی ص 77

جانورون کا لڑانا

کبوتر بازی

مرغ بازی

بٹیر بازی

پتنگ بازی

فنِ موسیقی

موسیقی اور محرم

زیورات اور پوشاک

طعام

اخلاق ۔ آداب ۔ نشست و برخاست

شعرو شاعری

۳ ۔ طوائفوں کی زندگی ص ۱۶۸

رقص و طوائف

مکان

لباس و زیورات

اخلاق و عادات

محفلیں

۴ ۔ میلے ٹھیلے اور رسوم ص ۱۷۳

الف۔ میلے ٹھیلے

لکھنؤ کے میلے

چھڑیوں کا میلہ

عیش باغ کے میلے

آٹھوں کا میلہ

قیصر باغ کے میلے

گنون کا میلہ

زیبی پائن کا میلہ

زیبی پچھاون کا میلہ

اجودھیا کا میلہ

چھٹہ کا میلہ

ب ۔ رسوم ص ۹۹۵

شادی بیاہ کی رسمیں

چھٹی کی رسم

عقیقہ

ختنہ

دودھ بڑھائی

کھیر چٹائی

بسم اللہ

روزہ کشائی

غمی کی رسوم

چہلم یا چالیسوان

۵ ۔ صنعت و حرفت ص 220

ظروف

آبخورے

صراحیاں

حقّے

ہانڈیاں

کھلونے اور مورتیاں

محرّم

ملبوسات و زیورات

# " مقدمة "

## مقدمہ ۔

ہندوستان کی سیاسی سماجی اور ادبی تاریخ مین اودھ کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے ۔ اس نے زندگی کے ہر شعبہ مین ایک اہم کردار ادا کیا ہے ۔ اور ملک کی تاریخ مین قابل قدر اضافے کیئے ہین ۔

سلطنت اودھ کا قیام اٹھارھوین صدی عیسوی کے اوائل مین عمل مین آیا ۱۷۲۲ء مین نواب برہان الملک سعادت خان نے صوبہ اودھ کے گورنر کی حیثیت سے عنان حکومت سنبھالی تو اُنھون نے فیض آباد کو اپنا دارالخلافہ قرار دیا ۔ اس کے بعد فیض آباد کی گویا قسمت جاگ اُٹھی اور اسکو شمالی ہند مین ایک غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی ۔ اس طرح اس خطہ کی سیاسی اور ثقافتی زندگی مین ایک نئے باب کا آغاز ہوا ۔ علوم وفنون کی ترقی کے دروازے کھل گئے اور فنکارون کو درباری سرپرستی حاصل ہوگئی ۔ برہان الملک ایک دور اندیش سیاستدان اور باصلاحیت حکمران تھے ۔اور اپنے جانشینون کی طرح آرام طلب نہ تھے ۔ اُنھون نے اپنے حُسن انتظام اور تدّبر سے ایک قلیل مدّت مین ہی اپنی سلطنت کو استحکام بخشا ۔ فیض آباد کی رونق مین بھی دن دونی رات چوگنی ترقی ہوئی ۔ دیکھتے ہی دیکھتے متعدد باغات عالیشان عمارات اور بازار تعمیر ہو گئے اور عام خوشحالی مین زبردست اِضافہ ہوا ۔

برہان الملک کا انتقال ۱۷۳۹ء مین ہوا ۔

ان کے بعد ان کے خویش صفدر جنگ سریر آرائے سلطنت ہوئے ۔ ان کا زمانہ بڑا پر آشوب رہا ۔ لیکن اس کے باوجود صوبہ اودھ کی ترقی کی رفتار مین کوئی خلل واقع نہین ہوا ۔ انھون نے فیض آباد کو با رونق اور شاندار بنانے مین کافی دلچسپی لی اور متعدد عالی شان عمارتین تعمیر کرائین اور سیر و تفریح کے لئے باغ لگوائے امجد علی خان مولف تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ " کا بیان ہے ۔

" صفدر جنگ نے فیض آباد کو آباد کرنے کی بنیاد ڈالی لکھنئو کے جنوب مین جلال آباد مین قلعہ تعمیر کرایا اور شیخون سے پنج محل لے کر انھین سو ایکڑ آراضی اس کے ملحقہ مین بمقام دو گاوان لکھنئو مین دیدی ۔ اور پنج محل مین کچھ ردوبدل کروا کے اس کا نام " مچھی بھون " رکھا ۔ ان کی بنوائی ہوئی عمارت گلاب باڑی آج بھی فیض آباد کی زینت ہے "۔[1]

---

[1] ۔ امجد علی خان ۔ تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ ۔ صفحہ ۔

صفدر جنگ ایک عالی حوصلہ اور اولوالعزم فرمانروا تھے ۔ ان کے حسنِ تدبر سے صوبہ اودھ کو بڑی حد تک خود مختاری حاصل ہوگئی اور سلطنت دھلی سے اس کا تعلق برائے نام ھی رہ گیا ۔ ان کے عہد کے فیض آباد کی شان و شوکت کا نقشہ معاصر مورخ منشی فیض بخش نے اپنی تالیف " تاریخ فرح بخش " مین انِ الفاظ مین کھینچا ھے ۔

" ایک عجیب رونق و تمکنت کا شہر نظر آیا ۔ جس مین وضعدارانِ دھلی مین سے خوش پوشاک اور وضعدار شریف زادے حاذق اطبائے یونانی اعلی درجے کے مردانے اور زنانے طائفے ھر شہر اور مقام کے مشہور با کمال گویئے سرکاری ملازم تھے اور بڑی بڑی تنخواھین پاکر عیش و فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے۔ ادنی و اعلی سب کی جیبین روپیون اشرفیون سے بھری ھوئی تھین اور ایسا نظر آتا تھا کہ جیسے یہان کبھی کسی نے افلاس و احتیاج کو خواب مین نہین دیکھا ھے ۔ نواب وزیر شجاع الدّولہ بہادر شہر کی سر سبزی و رونق و رعایا کی مرفہ الحالی مین ھمہ تن مصروف ھین اور معلوم ھوتا ھے کہ چند ھی روز مین فیض آباد دھلی کی ھم سری کا دعوی کرے گا " ۔

لیکن فیض آباد کی یہ شان و شوکت زیادہ عرصہ تک برقرار نہ رہ سکی ۔ کیونکہ نواب صفدر جنگ کے جانشین نواب شجاع الدّولہ (۷۵ ـ ۱۷۵۳ء) فیض آباد کے مقابلہ مین لکھنؤ کو زیادہ ترجیح دیتے تھے اور دراصل لکھنؤ ہی کو مرکز حکومت بنانا چاہتے تھے ۔ لیکن اپنی بیگم نواب امتہ الزہراء بیگم عرف بہو بیگم کی وجہ سے ایسا نہ کر سکے ۔ نواب امتہ الزہرا بیگم با اثر اور طاقتور خاتون تھین ۔ شہنشاہ محمّد شاہ کی منہ بولی بیٹی اور بڑی چہتی بیٹی تھین ۔ انھون نے ان کی شادی نواب شجاع الدّولہ سے بڑی شان و شوکت سے کی تھی ۔ اس لئے ان کی مرضی کے خلاف کام کرنا آسان نہ تھا ۔ بیگم صاحبہ کو فیض آباد سے خصوصی تعلق خاطر تھا وہ اس کو خیرباد کہنا برداشت نہین کر سکتین تھین ۔ چنانچہ بے پناہ خواہش کے باوجود نواب شجاع الدّولہ فیض آباد کو نہ چھوڑ سکے البتہ انھون نے اتنا ضرور کیا کہ لکھنؤ کی ترقی مین دلچسپی لینے لگے ۔ اس طرح ان کے عہد سے "عروس البلاد " فیض آباد کا سہاگ اُجڑنا شروع ہو گیا اور لکھنؤ دلہن کی مانند سجنے لگا ۔

شجاع الدّولہ کا ۱۷۷۵ء مین انتقال ہو گیا ۔ ان کے بارے مین میر تقی میر کا یہ جملہ بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔

" شجاع الدّولہ اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا لوگون نے ماتم کیا ۔ اگر اسمان ہزار سال چکر کھائے

تو ایسا صاحب جرأت اور سراپا مروت سردار پیدا

نہ ہو گا "۔ [1]

شجاع الدولہ کے بعد نواب آصف الدولہ ان کے جانشین مقرر ہوئے ۔ انھون نے ۲۲ سال (۹۷ ۔۱۷۷۵ء) حکومت کی ۔ ان کے عہد مین اودھ مین ایک نئے دور کا اغاز ہوا ۔ ان کی فیاضی اور فیض رسانی فقید المثال تھی ۔ انھون نے لکھنؤ کو مرکز قرار دیا اور فیض آباد سے رشتہ توڑ لیا ۔ لیکن بد قسمتی سے سیاسی طور پر وہ استحکام حاصل نہ کر سکے جو نواب شجاع الدّولہ کو حاصل تھا ۔ نواب بہو بیگم سے بھی ان کے تعلقات خوشگوار نہ رہ سکے ۔ ادھر انگریزون نے بھی سلطنت اودھ کو ہر طرح سے اپنے شکنجہ مین جکڑنا شروع کر دیا ۔ امجد علی خان کا بیان ہے ۔

" مان اور دادی کی مخالفت سے نواب آصف الدّولہ کا فیض آباد مین رہنا دشوار ہو گیا ۔ اس لئے دارالحکومت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہو گیا ۔ لیکن یہان بھی نواب آصف الدّولہ سیاسی طور پر پر سکون نہین رہے اور درباری سازشون کا شکار رہے ۔ انگریز جونکہ کی طرح سلطنت اور رعایا کا

---

[1] ۔ خواجہ احمد فاروقی ۔ میر حیات اور شاعری ۔ ص ۱۷۰

خون چوس رہے تھے ۔ بکسر کی جنگ کے بعد سے
انگریزون کا کافی رعب و دبدبہ ہو گیا تھا ۔ دیسی
راجاؤن کے درباری ملازم انگریزون کے آلۂ کار اور
مقرب ہونا پسند کرتے تھے ۔ اس وقت تعلیم یافتہ
اور ترقی پسند لوگ انگریزون سے مراسم پیدا کرنے
مین اپنے مستقبل کی بہتری سمجھتے تھے ۔ یہی
وجہ تھی کہ نواب آصف الدّولہ کے درباری اہل کار
بھی بظاہر نواب کے ساتھ تھے مگر باطن مین
انگریزون کے آلۂ کار تھے "۔[۱]

لیکن اس سیاسی کمزوری اور اندرونی خلفشار کے باوجود نواب آصف الدّولہ کی فیاضی، ادب نوازی اور فن کارون کی اعانت اور سر پرستی مین کوئی کمی واقع نہین ہوئی ۔ ان کی فیاضی آج تک ضرب المثل بنی ہوئی ہے ۔ ان کو فنون لطیفہ عموماً اور فن تعمیر سے خصوصاً لگاؤ تھا ۔ ان کے عہد کی قابل ذکر عمارتون مین اِمام باڑہ ۔ دولت خانہ ریزیڈنسی اور عیش باغ جیسی عالیشان اور شہرہ آفاق عمارتین ہین ۔ ان کے علاوہ ان کے عہد مین متعدد محلّے آباد ہوئے ۔ ہر طرف دولت فارغ البالی اور عیش و نشاط کا دور دورہ تھا ۔ جس کی شہرت اودھ سے گذر کر ملک کے مختلف علاقون مین پہنچنے لگی ۔ اس سے متاثر ہو کر مختلف فنون کے ماہرین اپنے اپنے مولد و مستقر چھوڑ کر لکھنؤ کی طرف کوچ کرنے لگے ۔ آصف الدّولہ خود شاعر تھے اور شعر و شاعری کے

دلدادہ بھی ۔ شاعر نواز تھے اور ادیبوں و شاعروں کی سر پرستی کرتے تھے ۔ اس لئے دور دراز علاقوں سے بہت سے شاعر لکھنؤ آئے اور ان کے دربار سے وابستہ ہو گئے ۔ ان میں صاحبِ مثنوی سحر البیان اور بعد میں میر انیس فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہو گئے ۔ مرزا محمّد رفیع سودا ۔ قمرالدین منت میر سوز ۔ میر تقی میر ۔قلندر بخش جرات ۔ اِنشاء اللّٰہ خان انشاء ۔ مصحفی ۔ سعادت یار خان رنگین اور نسیم دہلوی جیسے اساتذہ سخن نے دہلی سے ہجرت کر کے دیار لکھنؤ کو رونق بخشی ۔ اس طرح بقول انشاء دہلی کی شمع سے لکھنؤ کی محفل روشن ہوئی ۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی کی مرکزی حیثیت کمزور پڑ گئی تھی ۔ سیاسی اور معاشی بد حالی نقطہ عروج کو پہونچ چکی تھی ۔ مغلیہ حکومت تنزل اور پستی کی طرف تیزی سے گامزن تھی ۔ امور سلطنت پر " کمپنی بہادر " کا شکنجہ سخت سے سخت تر ہوتا جا رہا تھا ۔ اہلِ فن اور اساتذہ سخن کی سر پرستی کے لئے قلعہ معلی کے دروازے بند ہوتے جا رہے تھے ۔ پورا معاشرہ ہی انحطاط پذیر تھا ۔ اس وقت دکن کی حکومتیں اور سلطنت اودھ ہی مرجع خلایق تھیں ۔ یہاں فن کی قدر و منزلت اور فنکار کی سر پرستی ہوتی تھی ۔ چنانچہ دہلی سے کچھ اہل فن تو حیدرآباد چلے گئے اور بیشتر نے لکھنؤ کی جانب کوچ کیا ۔ اس طرح دہلی کی محفلیں اُجڑنے لگیں اور دکن و اودھ کی محفلوں پر رنگ چڑھنے لگا ۔

نواب آصف الدّولہ کا ۱۷۹۷ء مین انتقال ہوا ۔ ان کے بعد ان کے جانشینون نے علم دوستی کی شمع کو روشن رکھا ۔ اور فن نیز اہل فن کی سر پرستی کی روایت کو برقرار رکھا ۔ اس کا سلسلہ آخری تاجدار اودھ جان عالم نواب واجد علی شاہ اختر ( ۵۵ ۔ ۱۸۴۷ء ) تک برقرار رہا بلکہ واجد علی شاہ کے عہد مین تو یہ نقطہ عروج کو پہنچ گیا ۔

نواب آصف الدّولہ کے بعد مرزا وزیر علی خان مسند نشین ہوئے اور آصف جاہ کا لقب اختیار کیا ۔ یہ انتہائی ذہین ہوش مند اور ہنرمند فرمانروا تھا ۔ ان کو تازی شمشیر افگنی تیراندازی اور چوگان بازی مین بڑی مہارت تھی ۔ امجد علی خان لکھتے ہین ۔

" اودھ کا یہ پانچوان وزیر بڑی خوبیون کا مالک تھا ۔ بڑا دلیر، بہادر اور شجاع تھا ۔ اس نواب نے اپنی قوت بازو، قوت عمل اور سیاسی شعور سے امورِ سلطنت کو انجام دینے کا تہیہ کیا اور انگریزون کی بےجا سیاسی جوڑ توڑ اور ملکی سرمایہ کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف قدم اٹھانے کا ارادہ کیا ۔ نواب وزیر علی خان نے اپنے دربار کے ان اہل کارون کے ساتھ بھی سخت رویہ اختیار کیا جو درپردہ انگریزون کے آلۂ کار تھے کیونکہ نواب وزیر علی خان

نے اپنے باپ نواب آصف الدّولہ کی نامرادی لاچاری اور
بے بسی کی موت اور سیاسی بندشین دیکھے ہوئے
تھے ۔ اس لئے ان درباری عہدہ دارون کی سازشون
سے چھٹکارا پانا اشد ضروری سمجھا جنھون نے
انگریزون کے اشارون پر سازشون کا جال بچھا رکھا تھا"[1]

انگریزون کو ان کا رویہ پسند نہین آیا چانچہ جنوری ۱۷۹۸ء مین انھین معزول کر کے بنارس مین اسیر کر دیا ۔ اور ان کی جگہ یمین الدّولہ نواب سعادت علی خان کو وزیر نامزد کر دیا ۔ مورخین کا بیان ہے کہ نواب سعادت علی خان نواب شجاع الدّولہ کی اولاد مین سب سے زیادہ ہونہار، ہوش مند اور تعلیم یافتہ تھے ۔ اور انھون نے اس نوجوان شہزادہ کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ کی تھی ۔ عنانِ حکومت سنبھالنے کے بعد انھون نے انتہائی ہوشمندی اور مصلحت کوشی سے حکومت کا کام چلایا ۔ ان کا عہد حسن انتظام تہذیب و ثقافت کی ترقی اور عوام کی بہبودی کا دور مانا جاتا ہے ۔ اس لئے مثل مشہور ہے " از سعادت تابہ سعادت "۔ یعنی سلطنت اودھ کا بہترین دور سعادت خان ۔ برہان الملک سے لے کر سعادت علی خان تک تھا ۔ ۱۸۱۴ء مین اچانک ان کی زندگی کا چراغ گُل ہو گیا ۔ ان کے بعد نواب غازی الدّین حیدر تخت نشین ہوئے ۔ انھون نے ۱۳ برس تک حکومت کی ۔

---

[1] ۔ امجد علی خان ۔ تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ ۔ ص ۱۱۷

یہ زمانہ بھی پریشانیون اور انگریزون کی ریشہ دوانیون کا رہا ۔ بادشاہ کو اپنون اور غیرون سے مستقل طور پر ہوشیار رہنا پڑا ۔ لیکن اس کے باوجود اس عہد مین تعمیر کا کام بڑے پیمانہ پر ہوا ۔ شیخ تصدق حسین کا بیان ہے۔

" بادشاہ کی یادگار مین انھون نے دو محلّے
حیدر آباد اور بادشاہ نگر آباد کیئے ۔ ان
کے علاوہ متعدد عمارتین بھی مثل مقبرہ نواب
سعادت علی خان، خورشید منزل، مبارک منزل،
شاہ منزل، ولایتی باغ ۔ چھتر منزل اور نجف
اشرف وغیرہ موصوف نے تعمیر کرائین "۔ [1]

نواب خود صاحبِ علم تھے اور اس کے فروغ کے لئے ہمیشہ کوشان رہتے تھے ۔ اچھّے شاعر تھے اور شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے ۔ سبط محمّد نقوی اُن کے بارے مین لکھتے ہین ۔

" غازی الدّین حیدر خود بھی ذی علم اور
کثیر المطالعہ شخص تھے ۔ انگریز سیاح بشپ
ہیبر نے ان کی وسعتِ معلومات کی تعریف کی
ہے ۔ ان کے علمی مذاق کے باعث ان کے دورِ
حکومت مین علمی سرگرمیون کو بڑا فروغ ہوا ۔

---

[1] ۔ تصدق حسین ۔ بیگمات اودھ ۔ صـ٦٣ـــه

مدرسہ علوم مشرقی کا قیام چھاپے خانون کا رواج
کتابون کی اشاعت وغیرہ کے لیئے اس دور کو یاد
کیا جاتا ہے ۔ اس دور کی کتابون مین تاج اللغات
بھی ہے " [1]

غازی حیدر الدین نے رصد گاہ کا بھی منصوبہ بنایا تھا ۔ لیکن وہ ان کی حیات مین مکمل نہ ہو سکا ۔ اس کی تفصیل بتاتے ہوئے پروفیسر مسعود حسن رضوی رقم طراز ہین ۔

" غازی الدین حیدر کو خواہش ہوئی کہ فن ہیئت
کا ایک آلۂ رصدی ایسا تیار ہو کہ قصر سلطنت
مین بیٹھے ہوئے حرکات کواکب اور سیارون کے
اوضاع کی سیر کرین ۔ علمائے لکھنؤ سے جو ہیئت
کی کتابون کا درس دیتے تھے درخواست کی گئی
اور چھ مہینہ کی مہلت دی گئی ۔ سب نے ایسی
صنعت جدید کی ترتیب مین عذر کیا خلیل الدین
خان نے حسب الحکم شاہی چھ دن مین ایک برنجی
آلے کا نقشہ تیار کر کے پیش کیا ۔ بادشاہ کو

---

[1] ۔ سبط محمد نقوی ۔ امجد علی خان ۔ ص ۶۴

بہت پسند آیا ۔ لیکن اس نقشہ کے مطابق آلہ
تیار کرنے کا موقع نہ ملا ۔ کہ تھوڑے زمانے مین
غازی الدین حیدر کا انتقال ہو گیا "۔ [1]

غازی الدین حیدر کا ۱۸۲۷ء مین انتقال ہو گیا ۔ ان کے بعد نصیر الدین حیدر سریر آرائے سلطنت ہوئے ۔ ان کے زمانے مین انگریزون کی گرفت اور بھی زیادہ ہوگئی ۔ نصیر الدین حیدر خود بھی انگریزی ماحول اور مغربی طرز معاشرت کے دلدادہ تھے ۔ شیخ تصدق حسین کا بیان ہے ۔

" شاہان اودھ مین نصیر الدین حیدر ولایتی اشیاء
اور یورپین طرز معاشرت کے بہت دلدادہ تھے ۔
چنانچہ انھون نے قصر شاہی کے کمرون مین انگریزی
طرز کا فرنیچر نہایت سلیقہ سے مغربی طرز پر
سجایا تھا اور ان کے کئی مصاحب بھی یورپین تھے" [2]

نصیر الدین حیدر ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور علم و ادب کی ترویج و ترقی مین خصوصی دلچسپی رکھتے تھے ۔ اس کا ایک ثبوت جامع اللغات کی اشاعت

---

[1] ۔ مسعود حسن رضوی ۔ شاہان اودھ کا علمی ذوق
( شمولہ نذر ذاکر ) ۔ ص ۱۷۸

[2] ۔ شیخ تصدق حسین ۔ بیگمات اودھ ۔ ص ۲۵۱

ہے ۔ اسے غازی الدین حیدر نے تیار کرانا شروع کیا تھا مگر اپنی حیات مین پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا سکے تھے ۔ نصیر الدین حیدر نے اس کی تکمیل و اشاعت مین ذاتی دلچسپی لی اور بڑے سائز کی آٹھ ضخیم جلدون مین اسے شایع کرایا ۔ انھون نے جدید تعلیم کے لئے اسکول قائم کیئے اور جس رصدگاہ کی داغ بیل غازی حیدر الدین نے ڈالی تھی اسے پایۂ تکمیل کو پہنچایا ۔ سید کمال حسین حیدری اس سلسلہ مین لکھتے ہین ۔

" اسکول انگریزی طلبا اور مشتاق زبان انگریزی کے واسطے بہ اہتمام رزیڈنٹ قایم کیا ۔ سب سے امر عمدہ یہ کیا کہ رمنہ موتی محل مین رصد خانۂ سلطانی بنوایا ۔ کپتان ہربرٹ صاحب اس کے مہتمم ہوئے ۔ مولوی اسمعیل سر گروہ طلباء ہوئے ۔ ہندوستان مین ایسا رصد خانہ کہان تھا "۔ [1]

نصیر الدین حیدر کا ۱۸۳۷ء مین انتقال ہوا ۔ ان کے جانشین سلطان زمان محمّد علی شاہ ہوئے ۔ ان کا زمانہ مختصر رہا ۔ لیکن مورخین نے ان کے عہد کی بہت تعریف کی ہے ۔ ۷ مئی ۱۸۴۲ء کو ان کا انتقال ہو گیا ۔ اس طرح پورے پانچ سال انھون نے حکومت کی ۔ ان کی وفات کے بعد ان

---

[1] ۔ کمال الدین حسین حیدری ۔ قیصر التواریخ ۔ جلد اول ۔ ص ۳۱۱

کے بڑے صاحبزادے شہزادہ امجد علی شاہ نے عنان حکومت سنبھالی ۔ یہ بڑے دیندار اور صنف مزاج بادشاہ تھے ۔ " مختصر سیر گلشن ہند " کے مولف بابو رام نے لکھا ہے کہ عدالت کا کام سید العلا اور سلطان العلماء کے سپرد تھا ۔ خود بادشاہ اپنا زیادہ تر وقت خدا کی عبادت مین گزارتے تھے ۔ مدرسہ شاہی کی بنیاد اسی عہد مین پڑی ۔ مدرسۂ سلطانیہ بھی اسی زمانہ مین قایم ہوا جس مین دو سو طلبہ تعلیم پاتے تھے ۔ اس کے علاوہ رصد خانے کی تکمیل اور آہنی پل کی تیاری بھی اسی عہد مین ہوئی ۔ مصنف " لکھنؤ کی تہذیبی میراث " کا بیان ہے ۔

" اب عنان سلطنت امجد علی شاہ کے ہاتھ مین آئی ۔ ان کو علماء اور فضلا کی صحبت سے فیض پہنچا تھا ۔ اور تعلیم بھی مشرقی طرز پر بہت اچھی ملی تھی ۔ اس لئے مذہبی احکام کی شدت کے ساتھ پابندی ان کے معمولات مین داخل تھی ۔ مقدمات کی معدلت رسانی بھی بمقتضائے حسن عقیدت مجتہدین ہی کو سپرد تھی ۔ چنانچہ سلطان العلماء کے پسر اکبر سید باقر صاحب کو مہتمم عدالت دیوانی فوجداری مقرر کیا تھا ۔ اور ہر ناظم ضلع کے پاس ایک اثنا عشری مفتی متعین تھا تاکہ احکام مشرقی کی طرف

راہبری کر سکے ۔ خزانۂ عامرہ سے زکوۃ باقاعدہ نکلتی
تھی جس کی تقسیم مجتہد العصر کے سپرد تھی "۔ [1]

محمد علی شاہ بھی اپنے پیشروؤں کی طرح علم و ادب کے دلدادہ تھے اور ادب کی ترقی سے دلچسپی رکھتے تھے ۔ ۱۸۴۷ء مین ان کا انتقال ہو گیا ۔ ان کے بعد نواب واجد علی شاہ رونق افروز تخت سلطنت ہوئے ۔ ان کی شخصیت بڑی متنازعہ فیہ رہی ہے ۔ بعض متعصب مورخین نے ان کی بڑی خراب تصویر پیش کی ہے اور ان کو انتہائی عیاش، عیش پرست اور لہو ولعب کا دلدادہ بتایا ہے ۔ اس کے برخلاف سنجیدہ اور غیر جانبدار مورخین اور ادباء ان کو انتہائی شریف صنف مزاج منتظم اور دور اندیش حکمران بتاتے ہین ۔ اس سلسلہ مین پنڈت سندر لال کی رائے سب سے زیادہ متوازن اور مناسب معلوم ہوتی ہے وہ لکھتے ہین ۔

" ہمارا مطلب یہ نہین ہے کہ واجد علی شاہ
کی زندگی مین عیش پرستی بالکل نہ تھی ۔ یا
یہ کہ اس کا چال چلن ہمیشہ معیاری چال
چلن تھا ۔ مگر ہم اپنے اس ہم وطن حکمران
کے بارے مین صرف سچائی اور انصاف کے خیال
سے کچھ باتین کہنا چاہتے ہین ۔ " ایک یہ

---

[1] ۔ لکھنؤ کی تہذیبی میراث ۔ مولفۂ صفدر حسین ۔ ص ۱۰۵

کہ واجد علی شاہ کی عیاشی کا زمانہ صرف اس
وقت شروع ہوا جس وقت انگریز گورنر جنرل اور انگریز
رزیڈنٹ کی بیجا مداخلت نے اسے اپنی فوج کو
قواعد کرانے تک سے روک دیا اس زمانہ مین بھی
واجد علی شاہ کی عیاشی کی نسبت جتنی باتین
کہی جاتی ہین ان مین ۹۰ فی صدی گھڑی
ہوئی اور جھوٹی ہین ۔ ان مین سچائی کی مقدار
ہرگز اس سے زیادہ نہین ہے جتنی دنیا کے
۹۰ فیصدی حکمرانون کی زندگی پائی جاتی ہے ۔
اور جتنی کلائیو وارن ہسٹنگز جیسے انگریز جنرلون
کی زندگی مین کہین زیادہ گری ہوئی اور غیر مہذب
شکل مین پائی جاتی تھی ۔ ساتھ ہی اس بے جا
مداخلت سے پہلے واجد علی شاہ کی زندگی ایک
والی ریاست کی حیثیت سے غیر معمولی نیکی اور
نیک چلنی کی زندگی تھی "۔ [1]

واجد علی شاہ غیر معمولی صلاحیتون کے مالک تھے ۔ علم و ادب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے ۔ خود شاعر تھے ۔ اختر تخلص کرتے تھے ۔ کثیر التصانیف

---

[1] ۔ سندر لال ۔ سن ستاون ۔ ص ۱۸۲۷

تھے ۔ اپنی ایک کتاب " نبی " مین اُنھون نے اپنی تصانیف کی تعداد ۴۶ بتائی ھے ۔ نواب امیر علی خان نے اپنی تالیف " وزیر نامہ " مین ان کی کتابون کی فہرست دی ھے ۔ اور لکھا ھے کہ مختلف علوم و فنون مین ان کی اور بہت سی تصانیف ھین ۔ ان کا علمی ذوق بہت پاکیزہ تھا ۔ معاصر تاریخ نگار " راجہ درگا پرشاد سندیلوی " کا بیان ھے ۔

" واجد علی شاہ کا سا کوئی بادشاہ علوم و فنون کی اس جامعیت کے ساتھ ھند کی سر زمین سے نہین اٹھا ۔ ایسے کسی فرمانروا نے اتنے فضل و کمال کے ساتھ مملکت ھندوستان کی فضا مین بادشاھی کا علم بلند نہین کیا ۔ ان کے عہد سلطنت مین نازک خیال شاعرون اور معنی شناس سخنورون نے ان کے پایہ تخت مین جمع ھو کر ان کی رتبہ شناسی اور قدر دانی سے آرزو کا دامن مراد کے پھولون سے بھرا اور القاب و خطاب و زر و جواھر سے وھم و خیال سے زیادہ بہرہ مند ھوئے ۔۔۔۔۔۔۔ان دنون اگرچہ سلطنت کے انتزاع، آمدنی کی قلت اور اخراجات کی کثرت سے خاطر اقدس طرح طرح کی فکرون سے دوچار رھتی ھے ۔ انتہائی شوق سخن کی وجہ سے اپنا وقت عزیز بیشتر علمی تذکرون مین گزارتے ھین اور اپنی تازہ

بتازہ تصنیفات اور تو یہ نو تالیفات سے اپنی بساط
مبارک کا حاشیہ نشینون کو بے انتہا فیوض پہنچائے
ہین " ۔ ؎

۱۸۵۵ء مین انگریزون نے واجد علی شاہ کو معزول کر کے کلکتہ کے مٹیا برج مین نظر بند کر دیا ۔ اور یون کہنا چاہیئے کہ ان کے ساتھ ہی سلطنت اودھ کا خاتمہ ہو گیا ۔

نوابین اودھ کے دور حکومت مین ایک سیکولر معاشرہ وجود مین آیا ۔ جس کے ہندو اور مسلم سبھی دلدادہ تھے ۔ نوابین اودھ اگرچہ شیعہ تھے ۔ لیکن ان کی یہ تعصبی اور وسیع القلبی کا یہ عالم تھا کہ وہ سنّی اور شیعہ، ہندو اور مسلم مین کوئی امتیاز نہین کرتے تھے ۔ واجد علی شاہ کی یہ تعصبی کا نقشہ مولانا عبدالحلیم شرر نے " گزشتہ لکھنؤ " مین بڑی تفصیل سے کھینچا ہے ۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہین ۔

" بادشاہ اگرچہ شیعہ تھے مگر مزاج مین مطلق
تعصب نہ تھا ۔ ان کا پرانا مقولہ تھا کہ میری
دو آنکھون مین سے ایک شیعہ ہے اور ایک سنّی
ایک بار دو شخصون مین مذہبی اختلاف پر مارپیٹ

---

؎ ۔ راجہ درگاہ پرشاد سندیلوی " بوستان اودھ " (بحوالہ نذر ذاکر ) صفحہ ۔ ۱۹۴ ۔

ہو گئی ۔ بادشاہ نے دونون کی معزولی کا حکم دیا
بلکہ اپنے وہان ممنوع الملازمتہ کر دیا اور فرمایا ۔
ایسے لوگون کا میرے یہان گزر نہین ہو سکتا "۔ [1]

اودھ بحیثیت مجموعی اس سیاسی خلفشار سے محفوظ رہا جو ہندوستان کی تقدیر تھا ۔ انگریزون کی پشت پناہی اسے حاصل رہی ۔ اور اس کی حیثیت ایک ایسے جزیرہ کی ہو گئی جس کی خوشحالی اور امن و عافیت پر دور و نزدیک کے علاقے رشک کرتے تھے ۔ اس صورت حال کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اودھ کی تہذیب مین تکلف ۔ تصنع اور نمائش کا غلبہ ہو گیا ۔ یہان جو جشن بھی ہوتا یا تقاریب بھی منائی جاتین ان مین رنگینی اور دولت پرستی کا اظہار ناگزیر تھا ۔ دربار کے آداب اور خواص کی روز مرہ زندگی پر بےجا تکلفات کی چھاپ تھی ۔ رفتہ رفتہ عوام بھی اس رنگ مین رنگ گئے ۔ دولت کی فراوانی اور فارغ البالی کے نتیجہ مین میلون ٹھیلون کا زور تھا ۔ تہوار بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے ۔ مشاغل اور تفریحات مین کبوتر بازی ۔ بٹیر بازی ۔ مرغ بازی اور پتنگ بازی عام تھی ۔ اور طوائفون کو سماج مین خصوصی مقام حاصل تھا ۔ مذہبی تقاریب مین محرّم بڑے جوش و خروش اور عقیدت و احترام سے منایا جاتا تھا ۔ عَلَم اور تعزیئے بڑی دھوم دھام سے نکالے جاتے تھے ۔ میلون مین قیصر باغ کا میلہ ۔ عیش باغ کا میلہ ۔ آٹھون کا میلہ اور چھڑیون کا میلہ

---

[1] ۔ گزشتہ لکھنؤ ۔ صـــ ۸۸ـــ

عوام سے زیادہ خواص کے باعث دلچسپی تھے ۔ قیصر باغ کا میلہ عہد واجد علی شاہ کی یادگار ہے ۔ قیصر باغ کی تعمیر واجد علی شاہ کے دور مین ہوئی ۔ اس کی شان و شوکت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے ۔ کہ اس کی تعمیر پر اس زمانے مین اسّی لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا ۔ اس میلہ کی ابتدا کے بارے مین مشہور ہے کہ واجد علی شاہ کی والدہ نے چھٹی کی رسم پر ان کو جوگیا لباس پہنایا تھا اور ان کی سالگرہ بھی اسی لباس مین کیا کرتی تھین ۔ تخت نشین ہونے کے بعد نواب نے اس تقریب کو ایک میلے کا رنگ دیدیا ۔ اس موقع پر پورے قیصر باغ کو جنّت کی طرح سجایا جاتا ہر شخص اور ہر شے جوگیا لباس مین ملبوس ہوتا ۔ تین دن تک مستقل یہ میلہ رہتا۔ان تین دن مین جوگیا لباس پہنے بغیر کوئی شخص قیصر باغ کے اندر داخل نہین ہو سکتا تھا ۔ عیش باغ کی ابتدا نواب آصف الدّولہ کے عہد مین ہوئی ۔ ساون کے مہینہ مین ہر جمعہ کو یہ میلہ ہوا کرتا مگر کچھ دنون کے بعد اس مین جمعہ کے ساتھ ہفتہ کا دن بھی شامل ہو گیا ۔ یہ دراصل ساون کے موسم کا میلہ تھا اور اس مین جو گانے گائے جاتے تھے وہ سب ساون کے موسم سے تعلق رکھتے تھے ۔

آٹھون کا میلہ راجہ ٹیک رائے کے تالاب پر منایا جاتا تھا ۔ اس جگہ پر ستیلا دیوی کا مندر بھی ہے ۔ میلہ کے دن ہندو مسلمان ہزارون کی تعداد مین جمع ہوتے نذر نیاز دیتے اور چڑھاوا چڑھاتے میلے کے دن ہجوم کا یہ عالم ہوتا گویا پورا شہر میلے مین اُمنڈ آیا ہو ۔

صبح سے شام تک میلے کا زور رہتا ۔

ہندو تہوارون مین ہولی بڑے زور و شور سے منائی جاتی تھی ۔ خود نواب اس مین شریک ہوتے لوگون پر رنگ پھینکتے اور گلال ملتے تھے۔ اودھ کے نوابین کو شکار کا بھی بڑا شوق تھا ۔ یہ لوگ شکار کو جاتے تو فوج کی فوج ساتھ ہوتی ۔ نیز جانورون کا لڑانا بھی نوابون اور امیرون کا محبوب مشغلہ تھا ۔ بقول مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی ۔

" جب لوگون کو ملک گیری وصف آرائی سے فرصت ملی
اور میدان جنگ مین کھڑے ہونے کا حوصلہ نہ رہا
تو جنگ جوئی کے جذبات نے جانورون کو لڑا لڑا کر
جانبازی و خون ریزی کا تماشہ دیکھنے کا مشغلہ
پیدا کر لیا "۔ [1]

جسم فروشی اگرچہ ہر زمانہ مین اور ہر سوسائٹی مین ایک قبیح پیشہ تصور کیا جاتا رہا ہے ۔ اور اس قوم کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے ۔ لکھنؤ مین ان کا کام دراصل اعلیٰ طبقہ کے لوگون اور بالخصوص نوابون اور امیرون کے لئے سامانِ عیش فراہم کرنا تھا ۔ اس لئے ان کا تربیت یافتہ ہونا ضروری تھا ۔ یہ مختلف علوم اور فنون کی تعلیم حاصل کرتی تھین اور عام طور سے شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتی اور حاضر جوابی مین بے مثال ہوتی تھین ۔ گویا حسن

---

[1] ۔ گزشتہ لکھنؤ ۔ ص ۱۶۳

صورت کے ساتھ ساتھ حسنِ اخلاق، حسنِ ادا، اور حسن معاشرت، ان کا جوہر تھا ۔

لکھنؤ کی اس تہذیب کی جھلکیاں معاصر ادبی شہ پارون مین ملتی ہین ۔ میر حسن ۔ میر تقی میر ۔ نسیم لکھنوی اور شوق لکھنوی کی مثنویون اور سرشار، رجب علی بیگ سرور، مرزا ہادی رسوا وغیرہ کی نثری تصنیفات مین اس تہذیب کے واضح اور مفصل نمونے ملتے ہین ۔ میر حسن نے سحر البیان مین اپنے عہد کے ماحول کی بھرپور عکاسی کی ہے اس مین اعلیٰ طبقہ کے تمدن و معاشرت کے حسین اور دلفریب مرقع ملتے ہین ۔میر حسن نے مختلف تقریبون اور رسمون کی دھوم دھام اور شان و شوکت کا بیان اس طور سے کیا ہے کہ آج بھی اسے پڑھتے وقت یہ معلوم ہوتا ہے ۔ کہ یہ سب کچھ ہمارے سامنے ہو رہا ہے میر حسن کی مثنوی سے اس دور کی تہذیب کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے ۔

اس مین شک نہین کہ دولت کی فراوانی تھی ۔ بادشاہ سخی تھے ۔ غریبی اور افلاس کا نام و نشان نہ تھا ۔ دور دور سے لوگ قسمت آزمانے آتے اور گوہر مراد سے دامن بھر کر جاتے ۔

ہمیشہ خوشی رات دن سیر باغ

نہ دیکھا کسی دل پہ جزلالہ داغ

سدا عیش و عشرت سدا راگ رنگ

نہ تھا زیست سے اپنی کوئی بتنگ

غنی وان ہوا جو کہ آیا تباہ

عجب شہر تھا وہ عجب بادشاہ

نہ دیکھا کسی نے کوئی وان فقیر

ہوئے اس کی دولت سے گھر گھر امیر

خوشی کے موقعوں پر رقص و سرور کی محفلیں گرم ہوتیں ۔ جن کا نقشہ میر حسن کے الفاظ میں یہ ہے ۔

خوشی کی زبس ہر طرف تھی بساط

لگے ناچنے اس پہ اہل نشاط

کناری کے جوڑے چمکتے ہوئے ۔

وہ پاؤں کے گھنگرو جھنکتے ہوئے

وہ بالے چمکتے ہوئے کان میں

پھڑکتا وہ نتھنے کا ہر آن میں

وہ گھٹنا وہ بڑھنا اداؤں کے ساتھ

دکھانا وہ رکھ رکھ کے چھاتی پہ ہاتھ

کسی کے چمکتے ہوئے نو رتن ۔

کسی کے وہ مکھڑے پہ نتھ کی پھبن

جب شاہی سواری باہر نکلتی تو پورے شہر کی آئینہ بندی کی جاتی اور جلوس اس شان و شوکت سے نکلتا کہ سورج اور چاند شرما جاتے ۔

سنہری رو پہلی وہ عماریان

شب و روز کی سی طرحداریان

چمکتے ہوئے بادلے کے نشان

سوارون کا غٹ اور پیادون کی شان

ہزارون ہی اطراف مین پال کی

جھلا بور کی جگمگی تال کی

وہ ماہی مراتب وہ سرد روان

وہ نوبت کے دولھے کا جیسے سمان

وہ اشتہ گھوڑون پہ نقارچی

قدم با قدم بالباس زری ۔

مرصع کے سازون سے کوتل سمند

کہ خوبی مین روح القدس سے دوچند

وہ فیلون کی اور میگ بر کی شان

جھکتے وہ مقیش کے سائبان

پنڈت دیا شنکر نسیم نے بھی مثنوی گلزار نسیم مین اپنے ماحول اور اپنے عہد کے لکھنئو کی بھرپور عکاسی اور ترجمانی کی ہے ۔ سحر البیان کی طرح اس مین بھی سلطنت کی شان و شوکت ۔ تقریبات کی دھوم دھام محفلون کی رونق بیاہ شادی کا ہجوم جلسون اور جلوسون کی رونق کے حسین مرقعے ملتے ہین ۔

میر تقی میر نواب آصف الدّولہ کے دربار سے وابستہ تھے ۔ نواب کو شکار کا شوق تھا ۔ ان کے شکار کا نقشہ انھون نے اپنے " صید نامون" مین کھینچا ھے ۔ چند اشعار ملاحظہ ھون ۔

چلا آصف الدّولہ بہر شکار　　نہاد بیابان سے اٹھا غبار
روانہ ھوئی فوج دریا کے رنگ　　لگے کانپنے ڈر سے شیرو پلنگ
طیور اشیانے سے جانے لگے　　وحوش اپنی جانین چھپانے لگے
نہ دیکھا نہ ھم نے سنا یہ شکار　　کہ بکری سا ھاتھی کو لیتے ھین مار

اس زمانے کی ھولی کا نقشہ میر نے ان الفاظ مین کھینچا ھے ۔

جس طرف دیکھیئے چراغان ھے　　شیشہ و شمع ھی نمایان ھے
باغ سے روشنی ھوئی ھے زیاد　　ھے یہ ھنگامہ تا جلال آباد
شمع و فانوس کا بہت ھے ھجوم　　شمع رنگون نے کر رکھی ھے دھوم

اس طرح سرشار کا فسانہ آزاد ۔ مرزا سودا کی " امراو جان ادا " اور شریف زادہ اور رجب علی بیگ سرور کے " فسانہ عجائب " مین بھی ھمین لکھنو کی مخصوص تہذیب کے بڑے اچھے نمونے ملتے ھین ۔ فسانہ آزاد چونکہ سب سے زیادہ طویل اور ضخیم تصنیف ھے اس لئے فطری طور پر اس مین سب سے زیادہ تفصیلی خاکے پائے جاتے ھین ۔

فسانہ آزاد اصلاً ھفت روزہ اخبار لکھنو مین قسطوار شایع ھوا ۔ اس کی پہلی قسط دسمبر ۱۸۷۸ء مین شایع ھوئی اور آخری دسمبر ۱۸۷۹ء مین ۔ اس طرح نثری ادب کا یہ شاندار قصر مکمل ایک سال مین بن

کر تیار ہوا ۔ اس کے بعد اس کو کتابی شکل مین شایع کیا گیا ۔ دیگر خصوصیات کے علاوہ اس کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس مین سرشار نے لکھنؤ کی پوری تہذیب اور سماجی کیفیت کی محاکاتی انداز مین تصویر کشی کی ہے ۔ اس مین طبقاتی زندگی کی کشمکش بھی ہے ۔ اُمراء و نوابین اور ان کے لواحقین کے باہمی تعلقات مین گرم جوشی اور گہرائی کے با وصف طبقاتی بعد موجود ہے ۔ نوابون اور امیرون کی محفلون مین مصاحبین کا وجود لازمی تھا ۔ یہ اپنے اپنے مربیون کی ہر ہر انداز سے خوشامد کرتے ان کی دلبستگی کا سامان مہیا کرتے اور ان کی جا و بے جا مدح سرائی کرتے تھے اور ایک حد تک سے تجاوز کرنے کا مطلب سرکار ی عتاب کو دعوت دینا ہوتا تھا ۔ سرشار کی تصانیف اور بالخصوص فسانہ آزاد مین لکھنؤ اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ جلوہ گر نظر آتا ہے ۔ سرشار رجب علی بیگ سرور کی طرح ماحول کی جزئیات پیش کرنے پر اکتفا نہین کرتے بلکہ ان کے ساتھ اشخاص کی تصویرین بھی پیش کرتے ہین ۔ بقول رام بابو سکسینہ ان کے اشخاص قصّہ سائے کی طرح ہمارے سامنے نہین گزرتے بلکہ وہ ہماری آپ کی طرح گوشت پوشت کے بنے ہوئے چلتے پھرتے جیتے جاگتے ہین ایک نقاد کے الفاظ ہین ۔

" سرشار نے سوسائٹی کی صحیح تصویرین اتنی گہرائی
اور اس قدر جزئیات کے ساتھ کھینچی ہین کہ نہ
اس سے پہلے سرور کے یہان ملتی ہین اور نہ اس
کے بعد رسوا کے یہان ۔ سرشار نے اپنی تصانیف

مین ان تصاویر کا ایک عظیم الشان ڈھیر لگا دیا
ھے جس مین ھمین ھر رنگ اور ھر قسم کی تصویر
ملتی ھے ۔ اشخاص مین علماء و فضلا نواب و روساء ان
کے صاحب بیگمات ان کے ملازمین افیمی، چانڈو باز،
تپنگ باز، بانکے پہلوان، کشتی گیر، بنوٹیے ۔ پٹے باز،
چور ۔ اٹھائی گیرے، شاہ صاحب، عامل، مداری، سرکس
والے، حلوائی، داروغہ، پروفیسر، نجومی، کرتال، ڈاکو لٹیرے
فوٹو گرافر، سپاھی، کمہار، کسان، عیسائی، خوشنویس ۔
اخبار والے، بھانڈ، تنباکو فروش، باغبان، تھانیدار، چور،
کانسٹبل، چودھری، ٹھاکر، پاسی، کپتان، قلفی والے، ۔
انگریز، کہار، بنیئے، جوھری، صراف، بھنگی، وکیل ۔
تھیٹر والے ۔ مشعلچی ۔ نائی ۔ نانبائی ۔ جیلر
نیچریئے ۔ گریجویٹ ۔ اسکول کے طلباء ۔ مکتب
کے مولوی ۔ پنواڑی ۔ سائیس ۔ مجاور ۔ تھیوسوفسٹ
سیاح ۔ بیرسٹر ۔ گارڈ ۔ اسٹیشن ماسٹر ۔ پھیری
والے ۔ ٹکٹ بابو ۔ آتشباز ۔ بہروپیئے ۔ تماش بین
گندھی ۔ مسخرے ۔ میونسپل کمشنر ۔ شاعر، شکاری
وغیرہ سب نظر آتے ھین ۔ عورتون مین بیگمات کے
علاوہ بھٹیاریان، ساقنین، ڈومنیان، طوائفین، میمین

آیائین ۔ ماسٹرنیان ۔ دائی ۔ ہر طبقہ کی عورت نظر
آتی ہے ۔ اور یہ سب ہمین چلتے پھرتے حرکت کرتے
لڑتے جھگڑتے دکھائی دیتے ہین ۔ اور معلوم ہوتا ہے
کہ مصنف نے ہمارے سامنے اشخاص کا ایک عظیم الشان
سمندر لا کر رکھ دیا ہے ۔ جس مین ہمین ہزارون
صورتین نظر آتی ہین ۔ اور یہی نہین بلکہ ہم ان
کو ان کی نمایان خصوصیات کی وجہ سے آسانی کے
ساتھ پہچان سکتے ہین ۔ ان کے ساتھ ظریفانہ
چٹکلے اور فقرہ بازیان ہین ۔ بد تمیز نوکرون اور
بد توفیق آقاؤن کے مرقع ہین ۔ مختلف طبقون کی
زبان ان کی بول چال ان کی اصطلاحات ان کا
لب و لہجہ ہر چیز بہت واضح اور عین مین ہے"۔ ـــلہ

اگرچہ واجد علی شاہ کی معزولی اور انگریزون کے تسلط کے بعد لکھنؤ کی معاشرت تنزل پذیر ہو گئی تھی اور اس پر سیاسی انحطاط اور معاشی بد حالی کے مہیب سائے منڈلانے لگے تھے ۔ اور اس مین نوابی عہد کی وہ شان و شوکت باقی نہین رہی تھی تاہم اس سنہری عہد کے کچھ نقوش باقی رہ گئے تھے ۔ سرشار نے تہذیب کے اس نشیب و فراز کو دیکھا تھا اس لئے انھون نے اس تہذیب کی باریک سے باریک جزئیات کو زندہ کر دکھایا ہے ۔ بقول پنڈت کشن پرشاد کول ۔

" سرشار نے ہمارے ادب کے چمنستان مین ایسے ایسے گل کھلائے ہین جو ایک زمانہ گزر جانے پر بھی نہ کمھلائے ہین نہ مرجھائے ہین ۔ جب چاہے ہاتھ سے بین کر چن لیجئے اور ان کی مہک سے دماغ کو تازہ کر لیجئے ۔ جب ایسے شاعرانہ دماغ اور منچلی طبیعت کے ہاتھون مین مصور کا قلم ہو تو کیا کیا معجزے دیکھنے مین نہ آئین گے ۔ سرشار نے اپنے زمانے کی لکھنئو کی سوسائٹی کی نقاشی کی ہے ۔ ان کا کینوس نہایت وسیع ہے ۔ زندگی کا کوئی پہلو نظر سے چوکا نہین ہے ۔ ان کے اس کشادہ اسٹیج پر قسم قسم کے ایکٹر اپنا اپنا پارٹ کرتے نظر آتے ہین ۔ طرح طرح کے کھلاڑی اپنا اپنا کرتب دکھاتے ہین ۔ ہر تصویر جو سامنے آتی ہے ۔ جیتی جاگتی بولتی چالتی اور ہنستی کھیلتی ہوئی غرض کہ زندگی سے بھرپور ہے ۔ ایسی تصویرین بھی ہین جن سے پھوہڑپن اور پھکڑپن آنکھین پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے ۔ لیکن زندگی نفاست اور متانت ہی تو نہین ہوتی اور مصور اسی کی تو نقشہ کشی کرے گا جو اس کے سامنے ہے ۔ چونکہ ان کی تصویرین سچی ہین اس لئے بھلی اور پیاری معلوم ہوتی ہین " ۔

فسانہ آزاد کی ان ہی خصوصیات کی بناء پر ضروری تھا ۔ کہ اس کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے اور اس کے حسن و قبیح کا غیر جانبدارانہ اور ناقدانہ جائزہ لیا جائے ۔ اسی ضرورت کے پیش نظر اپنے تحقیقی کام کے سلسلہ میں شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی کی جانب سے مجھے " فسانہ آزاد میں لکھنوی تہذیب کے عناصر " کے جائزہ کا کام تفویض ہوا ۔ ظاہر ہے یہ کام آسان نہ تھا ۔ فسانہ آزاد جیسی ضخیم کتاب میں ان عناصر کی چھان بین کرنا اور ان کو صفحۂ قرطاس پر لانا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا ۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میرے کام کے نگران محترم پروفیسر خورشید الاسلام صاحب مقرر ہوئے ۔ مجھے موصوف کے تجربے اور علم سے مستفیض ہونے کا موقع ملا ۔ ان کی ذاتی دلچسپی بزرگانہ شفقت اور قدم قدم پر رہنمائی نے میری بڑی مشکلات حل کیں ۔

طلحت سلطانہ

# باب ا

## لکھنؤ کی مختصر تاریخ .

## " شاہان اودھ کا طرز معاشرت اور ان کی تہذیبی دلچسپیاں "

[1] ہندوستان کی تاریخ مین اودھ کا اہم حصّہ رہا ہے۔ پہلے زمانہ مین یہ علاقہ سورج بنسی خاندان کے قبضہ مین تھا ۔ اُس کی جنوبی حدود دریائے گنگا بہار مغربی حدود دلّی آگرہ اور شمالی حد کوہستان نیپال تھی ۔ [2] تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً بارہ سو سال قبل مسیح اس ملک کا نام کوشلا تھا ۔ اور اسی نام کی قوم اُس مین آباد تھی ۔

[3] اودھ کے بارے مین شاستر مین لکھا ہے ۔ کہ منو نے سب سے پہلے اس کو بسایا ۔ اجودھیا کوشلا یا اودھ کا دارالحکومت تھا ۔ اور یہ سرجو دریا ( جدید گھاگرا ) پر واقع تھا ۔ راجا دشرتھ سورج بنسی سورج نسل سے تعلق رکھتے تھے ۔ [4] شری رام چندر جی اسی راجا کے بیٹے تھے ۔

[5] اودھ کے معنی وعدہ پورا کرنا ہے ۔ یہ لفظ سنسکرت کا ہے ۔ لیکن اس کا قدیمی نام اتر کوشل ہی ہے ۔

---

[1] ۔ سرشار ایک مطالعہ ۔ از پریم پال اشک ۔ بحوالہ اودھ تاریخی تہذیبی اور ادبی ایشیئے مین ۔ ص۱۱۱

[2] ۔ تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ ۔ امجد علی خان ۔ ص۱۵۳

[3] ۔ تاریخی شہ پارے ۔ ص۱۲۱

[4] ۔ تاریخی شہ پارے ۔ ص۱۱۱

[5] ۔ گزشتہ لکھنؤ ۔ عبدالحلیم شرر

اور شاستروں کے کہنے کے مطابق منو نے سب سے پہلے اس شہر کو بسایا تھا۔ لیکن جب راجہ رام چندر جی چودہ سال بن باس کاٹ کر لوٹے تو اس مناسبت سے اس کا نام اودھ پڑ گیا ۔ اودھ میں ایک شہر اجودھیا ہے ۔ جو ہندوؤں کے لئے ایک متبرک مقام ہے ۔

اس زمانے کی اودھ کی تہذیب و تمدن کا ذکر کرتے ہوئے مرزا علی اظہر برلاس لکھتے ہیں ۔

" رامائن میں ایک اعلی ترقی یافتہ معاشرہ بنیان ہے ۔ اس وقت کے لوگ زیادہ تر زراعت میں مشغول تھے ۔ لیکن ایک ترقی پذیر تاجر طبقہ بھی وجود میں آ رہا تھا ۔ اجودھیا کے آباد شہر کی ایک نہایت دلچسپ تصویر تاجروں کے ان مختلف طبقوں کے ذکر سے ہمارے سامنے آ جاتی ہے ۔ جنھوں نے رام کا اس کی طویل جلا وطنی سے دارالحکومت میں فتحمندانہ واپسی پر خیر مقدم کیا تھا " راج کنور رام کا خیر مقدم دوسرے لوگوں کے علاوہ بڑے تاجروں، جواہر تراشوں، ندافوں، اسلحہ سازوں، اراکشوں، شیشہ گروں، نجّاروں، طبیبوں، چراغ سازوں، مے فروشوں، دھوبیوں، درزیوں، اداکاروں اور سر کی مالش کرنے والوں تک

نے کیا Shampooneers کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ معاشرہ

بلا شبہ اعلی درجہ کا ترقی یافتہ تھا "[1]

بہرحال اٹھارویں صدی میں جب مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوا اور اورنگ زیب کے بعد جو انتشار پیدا ہوا تھا وہ سیلاب بن گیا تو قصرِ شاہی کی بنیاد متزلزل ہونے لگی اس سیاسی فضا میں سکون روز بروز کم ہوتا گیا ۔ معاشی بد حالی متقاضی تھی کہ فنکار کوئی اور ٹھکانا تلاش کریں جہاں سرپرستی و عافیت نصیب ہو سکے ۔ غرض موسیقار، اہل علم، دست کار، اور شعراء دہلی چھوڑ کر لکھنؤ آ گئے ۔ جہاں ان کو ضروری سکون اور سرپرستی حاصل ہوئی ۔

---

[1] ۔ اودھ کی مختصر تاریخ ۔ امجد علی خان ۔ ص۵۳ ۔ بحوالہ تاریخی شہ پارے ۔ ص۲۷

**فیض آباد ۔**

سلطنت اودھ کا پہلا تمدنی مرکز فیض آباد تھا ۔ جس کی بنیاد قدیم ہندو زیارت گاہ " اجودھیا " کے متصل برہان الملک نے ڈالی ۔ اوّل اوّل اس جگہ کو بنگلے کی حیثیت حاصل تھی ۔ یعنی دورہ ملک کے زمانے مین حاکمون کا یہان قیام ہوتا تھا ۔ لیکن بعد مین اسے حویلی اودھ کا درجہ مل گیا ۔ رفتہ رفتہ بہت سے بازار سرکاری دفاتر باغات اور عمارتین بن گئین ۔ اور صفدر جنگ کے زمانے مین اسے فیض آباد کا نام دے دیا گیا ۔ شجاع الدّولہ کے عہد مین اسے اتنا عروج حاصل ہوا کہ بعض سیاحون نے فیض آباد کو لکھنؤ پر ترجیح دی ۔ ان دونون شہرون کی آبادی کے انداز اور ترتیب مین جو فرق تھا ۔ اس کے کئی اسباب تھے ۔ مثلاً فیض آباد یہان کے فرمان رواؤن کی تجاویز اور خاکون کے مطابق تعمیر ہوا تھا ۔ اس لئے اس کے بازار باغات اور عمارتین عظمت و جبروت سے عاری نہ تھے ۔ برخلاف اس کے لکھنؤ قدیم زمانہ سے ایک ناہموار زمین پر آباد چلا آ رہا تھا ۔ جس مین دربار کے منتقل ہو جانے پر حسب ضرورت بعض عمارتین وجود مین آ گئی تھین ۔ قدیم محل اور مکان ویسے ہی رہے ۔ یہی وجہ تھی کہ لکھنؤ کے مقابلے مین اب بھی فیض آباد زیادہ شاندار تھا ۔

تاریخ فرح بخش کے مصنف منشی فیض بخش کا کہنا ہے ۔

" مین جب پہلے پہل گھر چھوڑ کر فیض آباد

گیا ہون ممتاز نگر ہی تک پہونچا تھا جو

شہر کے مغربی پھاٹک سے چار میل کے فاصلے
پر ہے مین نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے
انواع و اقسام کی مٹھائیاں، گرما گرم کھانے، کباب
سالن، روٹیان اور پراٹھے وغیرہ بک رہے ہین۔
سبیلین رکھی ہوئی ہین۔ نان خطائیان، مختلف
قسم کے شربت اور فالودہ بھی بک رہا ہے۔ اور
صدہا آدمی خریداری کے لئے ان دوکانون پر
گرے پڑتے ہین۔ مجھے خیال گذرا کہ مین
شہر کے اندر داخل ہو گیا اور خاص چوک مین
مین ہون۔ مگر متحیّر تھا کہ ابھی تک شہر کا
پھاٹک تو آیا ہی نہین مین اندر کیسے پہونچ
گیا؟۔ لوگون سے پوچھا تو ایک راہگیر نے کہا!
" جناب شہر کا پھاٹک یہان سے چار میل ہے
اپ کس خیال مین ہین"۔ اس جواب پر حیرت
کرتا ہوا شہر مین داخل ہوا، تو عجیب جہل
پہل نظر آئی۔ رنگینیان تھین اور دلچسپیان۔
جدھر دیکھتا ہون ناچ ہو رہا ہے۔ مداری
تماشا کر رہے ہین اور لوگ طرح طرح سے سیر
تماشون مین مصروف ہین۔ یہ رونق اور شوروہنگامہ

دیکھ کر مبہوت رہ گیا ۔ صبح سے شام تک اور
شام سے صبح تک کوئی وقت نہ ہوتا جب فوجون
اور پلٹنون کے نقارون کی آواز نہ سنی جاتی ہو۔
پہرون اور گھڑیون کے بتانے کے لئے بار بار نوبت بجتی
اور گھڑیون پر موگریان پڑتین جن کے شور و غل
سے کان اڑے جاتے۔ سڑکون پر دیکھئے تو ہر دم
گھوڑون، ہاتھیون، اونٹون، خچرون، شکاری کتون، گائے
بھینسون، بیلون، چھکڑون اور توپون کے گزرنے کا
سلسلہ جاری رہتا ۔ جن کا شمار حساب اور اندازے
سے باہر تھا راستہ چلنا دشوار تھا "
" ایک عجیب رونق و تمکنت کا شہر نظر آیا ۔ جس
مین وضعدارانِ دھلی مین سے خوش پوشاک اور
وضعدار شریف زادے حاذق اطبائے یونانی اعلی
درجے کے مردانے اور زنانے طائفے ہر شہر اور
مقام کے مشہور اور باکمال گویئے سرکار مین ملازم
تھے اور بڑی بڑی تنخواہین پا کے عیش و فارغالبالی
کی زندگی بسر کرتے ادنی اور اعلی سب کی جیبین
روپیون اشرفیون سے بھری ہوئی تھین ۔ اور ایسا
نظر انا تھا ۔ کہ جیسے یہان کبھی کسی نے افلاس و احتیاج

کو خواب مین بھی نہین دیکھا ہے ۔ نواب
شجاع الدّولہ بہادر شہر کی سرسبزی و رونق
و رعایا کی عرفہ الحالی مین ہمہ تن مصروف ہین
اور معلوم ہوتا ہے ۔ کہ چند ہی روز مین
فیض آباد دہلی کی ہمسری کا دعوی کرے گا" [1]

لیکن فیض آباد کی شان و شوکت کی عمر نو دس سال سے زیادہ نہ ہوئی ۔ کیونکہ آصف الدّولہ نے ۱۷۷۵ء ۔ ۱۱۸۹ھ مین وارث سلطنت ہو کر اپنا دربار لکھنئو مین منتقل کر لیا ۔ جس کی وجہ سے تمام شرفاء تجّار، علماء فضلا صنّاع اور دیگر اہلِ کمال بھی فیض آباد کو چھوڑ کر لکھنئو آ گئے ۔ اب یہان سے فیض آباد کی رونق کم اور لکھنئو کے تہذیب و تمدن کو عروج حاصل ہوا ۔

---

[1] ۔ بحوالہ گزشتہ لکھنئو ۔ ص ۱۶ ۔ ۱۷ ۔ ۱۸

## لکھنؤ ۔

گومتی ندی کے کنارے بسے ہوئے لکھنؤ کا رقبہ ۹۶۱ مربع میل ہے ۔ صوبہ مین رام پور کے بعد سب سے چھوٹا ضلع ہے۔[1] یہ ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہین کہ شری رام چندر جی نے بن باس سے لوٹنے کے بعد لکھنؤ کو اپنے بھائی لچھمن کو دے دیا تھا ۔ لچھمن جی نے یہان ایک بلند مقام پر کچھ دن قیام بھی فرمایا تھا ۔ جب سے شاید اس مقام کو لچھمن ٹیلہ کہا جانے لگا ۔ لچھمن ٹیلہ کے متصل ایک گاؤن بھی آباد تھا ۔ اس گاؤن کا نام لچھمن پور تھا اور اس مین برھمنون کی آبادی تھی ۔ ممکن ہے اسی گاؤن کے نام پر اس شہر کا نام بھی لچھمن پور ہو گیا ہو ۔ مرزا علی اظہر برلاس کہتے ہین ۔

" اِمام باڑہ آصف الدّولہ کے شمال مین لب دریا
جس ٹیلے پر عالمگیری مسجد ہے ۔ اور جس کو
عام طور پر آج کل لکھنؤ مین ٹیلے کی مسجد
بادشاہ پیر محمّد صاحب کا ٹیلہ کہتے ہین ۔
اس کا نام پہلے لچھمن ٹیلہ تھا ۔ اور کہا
جاتا ہے کہ یہان لچھمن پور آباد تھا ۔ جس
کی آبادی اجوّدھیا سے جو یہان سے تقریبا
پچاس میل ہے متصل تھی ----------

---

[1] ۔ لکھنؤ کی تہذیبی میراث ۔ ص۲۲

لکھنئو دریائے گومتی کے داھنے کنارے پر آباد
ھے - پہلے یہان برھمنون اور راجپوتون کی
آبادی تھی - ۱۱۶۰ء مین چند خاندان شیوخ
نے جو مسعود غازی کے ساتھ آئے تھے -
لکھنئو پر قبضہ کر لیا - اور اِس وقت سے وھی
یہان حکمرانی کرتے رھے - انھون نے ایک
مستحکم قلعہ بنوایا تھا - اور چونکہ اس قلعہ
کی تعمیر لکھنا اھیر کے سپرد تھی - اس وجہ
سے بردایئے لکھنا اور لچھمن پور بگڑ کر لکھنئو
ھو گیا - مگر اس کا تعین بہت مشکل ھے کہ
اس شہر کا نام لکھنئو کب پڑا - اِتنا پتہ ضرور
چلتا ھے - کہ ھمایون بادشاہ ۱۵۴۰ء مین
شیر شاہ کی جنگ مین لکھنئو مین چار گھنٹے
ٹھرا تھا - اور یہان سے اس کو روپیہ اور
گھوڑون کی مدد کی گئی تھی " [1]

پھر اکبر کے زمانے مین لکھنئو ترقی کرنے لگا تھا اور اس کی آبادی بڑھتی اور پھیلتی جاتی تھی - یہ صحیح ھے کہ صوبہ دار اودھ انھین شیخزادون

---

[1] - تاریخی شہ پارے - صـ۲۲۲

مین سے منتخب ہوئے ۔ لیکن عام معمول یہ تھا کہ اس خدمت پر معزّزین دھلی مقرر ہوتے جو سالون سال اپنے گھر بیٹھے رہتے ۔ فقط تحصیل وصول کرنے کے زمانے مین ایک دورہ سا کرتے اور ان کے نائب یہان رہا کرتے ۔ لہذا ان سے شہر کی ترقی کی کوئی امید نہ کی جا سکتی تھی ۔ ہان یہان کے دو ایک شیخ زادے جو صوبہ دار مقرر ہو گئے تو ان کے تقرّر سے البتّہ لکھنئو کو فائدہ پہونچا ۔

اکبر کی توجہ لکھنئو کی طرف خاص معلوم ہوتی تھی ۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے یہان کے برھمنون کو باج پٹی چڑھاوے کے لیے ایک لاکھ روپیہ مرحمت فرمائے تھے ۔ اور اسی وقت سے لکھنئو کے باج پٹی برھمن مشہور ہوئے ۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنئو کے قدیم ترین ہندو محلے جو اکبر کے وقت مین موجود تھے ۔ باج پٹی ٹولہ ۔ کٹاری ٹولہ سوندھی ٹولہ ۔ بنجاری ٹولہ اور اھیری ٹولہ ہین ۔ اور یہ سب چوک ہی کے اطراف مین تھے ۔

پھر اکبر کے عہد مین چوک کے داھنے طرف بہت سے محلّے آباد ہو گئے ۔ شہزادہ سلیم جب لکھنئو آیا ۔ تو اس نے موزا منڈی باغ کی بنیاد رکھی ۔ ۱۵۷۴ء / ۹۸۲ھ مین اودھ کے صوبہ دار جواھر خان کے نائب قاسم محمد بلگرامی نے محمود نگر اور شاہ گنج محلّے بسائے ۔ چوک کے داھنے طرف اکبری دروازہ بن گیا ۔ شاہ جہان کے عہد مین سلطان علی شاہ قلی خان اودھ کے صوبہ دار مقرر ہوئے ۔ ان کے دو لڑکے فاضل اور منصور تھے ۔

جنھون نے چوک کے مغرب مین فاضل نگر اور منصور نگر نام کر محلّے بسائے ۔ اورنگ زیب اجودھیا سے لوٹتے ہوئے لکھنؤ ایا ۔ تو اس نے لچھمن ٹیلہ پر ایک مسجد تعمیر کروائی ۔ جو ٹیلے والی مسجد کے نام سے اب بھی موجود ہے ۔ اورنگ زیب نے اپنے لقب عالمگیر کی رعایت سے عالم نگر بسایا ۔

لہ شیخ عبدالرحیم بجنوری کی اولاد جو شیخ زادے کہلاتے تھے ۔ انھون نے لکھنؤ مین اپنے کو مستحکم اور منظّم کرلیا تھا ۔ حالانکہ اس خاندان سے صوبہ داری ختم ہو گئی تھی ۔ لیکن کسی صوبہ دار کو خاطر مین نہین لاتے تھے ۔ انھون نے مچھّی بھون کے پھاٹک پر ننگی تلوار لٹکا دی تھی تاکہ جو امیر یا صوبہ دار شاہی قلعہ مین داخل ہونا چاہے تو سر جھکائے بغیر اندر نہ آ سکے ۔ اور اس طریقہ سے شیخون کی عظمت و شوکت کے آگے سر نیاز خم کر دے ۔ شاید اسی سے اودھ مین " شیخون کی شیخی " ضرب المثل ہو گئی تھی ۔ ۲ہ

لیکن جب ۱۷۲۰ء مین نواب سعادت علی خان برہان الملک اودھ کے صوبہ دار مقرر ہو کر آئے تو انھون نے لکھنؤ آکر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ شیخ زادون کو مغلوب کیا اور وہ تلوار جو ایک عرصہ سے شیخ زادون کے وقار اور تمکنت کا نشان تھی گرا دی گئی ۔ ۳ہ

---

لہ ۔ رسالہ ۔ دلگداز جلد ۱۶ صفحہ ماہ فروری ۱۹۱۲ء

۲ہ ۔ بحوالہ تاریخی شہ پارے ۔

۳ہ ۔ تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ ۔ امجد علی خان ۔ صفحہ ۶۳

## نواب سعادت علی خان برہان الملک ۔

نواب سعادت علی خان برہان الملک کا نام سید محمد امین تھا ۔ یہ نیشا پور کے رہنے والے تھے [1] ان کا خاندانی سلسلہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ملتا ہے ۔ ۱۱۳۵ ھ محمدی (۱۷۰۶ء) عہد بہادر شاہ مین اُن کے والد میر محمد نصیر ہندوستان آئے ۔ ان کے ساتھ اُن کے بڑے لڑکے میر محمد باقر بھی تھے ۔ میر محمد باقر نے یہان شادی کرلی ۔ میر محمد باقر کو ہندوستانی بی بی سے خدا نے ایک بیٹا دیا ۔ جو بعد کو شیر جنگ کے مختار لقب سے مشہور ہوا ۔

میر محمد نصیر کے آنے کے دوسال بعد ان کے چھوٹے بیٹے جو میر محمد امین ہی تھے یہ بھی نیشا پور سے ہندوستان مین آگئے ۔ جب عظیم آباد پہونچے تو معلوم ہوا کہ باپ کا انتقال ہو گیا ۔ اب دونون بھائی میر محمد اور میر محمد امین دھلی روانہ ہوئے ۔ دھلی مین میر محمد امین کو شاھزادون کی جاگیر کا ٹھیکہ مل گیا ۔ یہ فرخ سیر کی بادشاھت کا زمانہ تھا " اس مین اُنھون نے ایسی ہوشیاری اور لیاقت دکھائی کہ تمام لوگون مین شہرت ہو گئی ۔ چند ہی روز کے بعد دربار شاھی کے معزز امیرون اور منصبدارون مین شامل ہو گئے ۔ پھر صوبہ دار اکبر آباد کی بیٹی سے نکاح ہو گیا ۔ اس لیے اعلیٰ طبقہ اُمراء مین شمار کیے جانے لگے ۔ جس پر سلطنت کی ذمہ داری اور خدمت کے لیے انتخاب کی نظرین پڑتی ہین ۔

---

[1] ۔ نیشا پور ۔ ایران ۔ اودھ کی مختصر تاریخ ۔ صفحہ

بیگمات اودھ مین ھے ۔

" ھندوستان پہونچ کر موصوف تھوڑے زمانے تک
سر بلند خان صوبہ دار گجرات کی مصاحبت
مین رھے جنھون نے بالاخر اُن کو سترہ روپیہ
ماھوار پر اپنے خیمے نصب کرنے کو میر منزل
کی خدمت پر مامور کر دیا ۔ ایک دن نواب
شکار کو گیئے خیمہ ایک نشیبی مقام پر استادہ
کیا گیا ۔ اتفاق سے اس روز تل دھاراوُپر
دھار بہت شدّت کی بارش ھوئی ۔ جس سے
جل تھل بھر گیئے ۔ اور نواب کے خیمے مین
پانی ھی پانی ھو گیا ۔ اُنھون نے ایک رتھ
پر بیٹھ کر تمام شب آنکھون مین کاٹی ۔
صبح کو میر محمد اَمین کو بلا کر بہت خفا
ھوئے اور فرمایا اپ کا دماغ تو ھفت ھزاریون
کا ایسا معلوم ھوتا ھے ۔ اپنے کام مین
دل ھی نہین لگاتے۔ محمد اَمین کو یہ
کلمات سخت ناگوار گذرے ۔ عرض کیا حضور
سید ھین آپ کی زبان مین تاثیر ضرور ھوگی
اس لئے اِرشاد عالی کو اپنے حق مین فال

نیک سمجھ کر ملازمت سے دست بردار ہوتا ہون
تاکہ ہفت ہزاری منصب کے لئے جا کر کوشش کرون
چنانچہ نوکری چھوڑ کر دھلی چلے آئے ۔ جہان
اس وقت قطب الملک نواب عبداللہ خان کا طوطی بول
رہا تھا ۔ ان کے دیوان رائے رتن چند سے راہ
رسم کر کے اول بزمانہ فرخ سیر منصب یک ہزاری
و نائب کروری حاصل کیا ۔ پھر ۱۱۲۸ ھ مین
شہزادون کی جاگیر ہنڈون و بیانہ کا ٹھیکہ
اٹھارہ لاکھ روپے ماہانہ پر لیا اور ۷/اکتوبر ۱۷۱۹ء
سے لے کر ۱۴ اکتوبر ۱۷۲۰ء تک فوجدار ( عامل )
بھی رہے ۔ مگر اپنے فرائض منصبی اتنی دیانتداری
سے اور عرق ریزی سے انجام دیئے کہ ہر شخص
کے دل مین ان کی جگہ ہو گئی ۔ اور بارگاہ
خسروی تک بھی رسائی ہو گئی ۔۔۔۔ ۱۱۳۰ھ مین
سعادت خان کے خطاب سے ممتاز ہو کر آگرہ کے
گورنر اور مہتم خاصان شاہی ہوئے ۔ اس کے بعد
اودھ سے جب رعایا کی سرکشی و تمرّدی اور منتظمین
کی بد رعیتی اور بد انتظامی کی خبرین دھلی
پہونچین تو سعادت خان کو صوبہ داری اودھ

کا خلعت مرحمت کر کے ۱۱۳۲ھ مین ( محمّد شاہ نے )
برہان الملک کے خطاب سے سرفراز فرمایا " [1]

جس وقت برہان الملک بہادر جنگ کا خطاب عطا ہوا ۔ اسی وقت اکبر آباد کے صوبہ دار مقرر ہوئے ۔ اس کے بعد پھر بادشاہی خواصون کی داروغگی ملی۔ یہ عہدہ بہت بڑا اور معزز ہوا کرتا تھا ۔ اس کے کچھ ہی دنون بعد جب بادشاہ کو معلوم ہوا کہ صوبہ اودھ ( جس کے انتظام مین گروھر بہادر ناکر تھا ) کا انتظام اچّھا نہین ہے ۔ اور بڑی بے اِنتظامی ہے تو بادشاہ نے برہان الملک کو یہ خدمت سونپی ۔ صوبہ داری اودھ کے ساتھ ساتھ وہ بادشاہی توپ خانہ کے داروغہ بھی مقرر ہوئے ۔ برہان الملک نہایت ہی مدّبر حکمران ثابت ہوئے ۔ یہ نہایت ہوشیار روشن دماغ اور بہادر شخص تھے ۔ توپ خانہ کو اپنے ہاتھ مین لے کر اُنھون نے ایسی طاقت حاصل کرلی کہ سارے ہندوستان مین کسی کو نصیب نہ ہوئی تھی ۔

اسی زمانہ مین بھگوت سنگھ نے جو کہ کوڑھ کا زمیندار تھا سلطنت سے سرتابی شروع کر دی ۔ کئی افسرون نے اس کا مقابلہ کیا مگر لیکن اس کے ہاتھ سے مارے گئے ۔ پھر آخر مین برہان الملک اس کے مقابلے کو گئے ۔ اور سخت لڑائی ہوئی ۔ بھگوت سنگھ نے چالاکی سے برہان الملک کو گھیر لیا ۔ پھر لڑائی کا رنگ ایسا بگڑا کہ بڑے بڑے بہادرون کے ہاتھ پاؤن پھول گئے ۔ مگر برہان الملک نے بہادری سے مقابلہ کیا ۔ اور

---

[1] ۔ بیگمات اودھ ۔ صفحہ

لڑائی کافی دیر تک جاری رہی اور آخر میں خود بھگوت سنگھ ان کے تیر کا نشانہ ہو گیا ۔ اور سارے دشمن بھاگ کھڑے ہوئے بھگوت سنگھ کا سر بادشاہ کے حضور میں دہلی لے جایا گیا ۔

اس زمانے میں ہندوستان میں مرہٹوں کا بھی بہت زور تھا ۔ انھوں نے دہلی کے بادشاہ سے چوتھ مقرر کرائی تھی ۔ اور بڑے سے بڑا سورما اُن کے آگے کانپتا تھا ۔ اور گھبراتا تھا ۔ برہان الملک نے مرہٹوں کو اپنی بہادری سے اور زبردست فوج کے ذریعہ ایسی بھاری شکست دی کہ ان کے ہوش و حواس جاتے رہے ۔ اور میدان چھوڑ کر ایسا بھاگے کہ پھر پیچھے مڑکر نہ دیکھا لیکن برہان الملک نے ان کا تعاقب جاری رکھا ۔ آخر میں مرہٹوں سے ان کا معاہدہ ہو گیا ۔ برہان الملک نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ بادشاہ میں اپنے نیک و بد کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے ۔

اسی طرح لکھنؤ میں شہزادوں کا بڑا زور تھا ۔ اور جس وقت برہان الملک لکھنؤ میں داخل ہوئے ۔ تو ان کو روکنے کی کوشش کی گئی ۔ لیکن برہان الملک اپنا بال بیکا کئے بغیر لکھنؤ میں داخل

---

سلہ ۔ گزشتہ لکھنؤ ۔

سلہ ۔ تاریخ اودھ ۔

ہو گئے ۔ لکھنؤ مین داخل ہونے سے متعلق گزشتہ لکھنؤ اور " تاریخ اودھ "
مین دو روایتین ملتی ہین ۔ ایک تو یہ کہ اکبری دروازے پر روکے گئے ۔ وہ
سمجھدار آدمی تھے روکنے پر رُک گئے ۔ اور محمود نگر مین پڑاؤ ڈال دیا دو
ایک دن کے بعد شیخزادون کی دعوت کی ۔ ان سے بڑی خاطر تواضع سے
پیش آئے ۔ لیکن جس وقت غافل شیخزادے الوان نعمت کا مزہ لوٹنے مین مصروف
تھے ۔ شاہی فوج خاموشی کے ساتھ چوک مین داخل ہو کر مچّھی بھون
تک جا پہونچی ۔

دوسری روایت یہ ہے کہ محمّد خان بنگش نے
برہان الملک کو بتا دیا تھا ۔ کہ لکھنؤ کے شیخزادے بڑے شوہ پشت ہین اُن
سے پیش آنا آسان کام نہین ۔ مگر قرب و جوار کے دوسرے شیوخ ان کے خلاف
ہین ۔ آپ اُن لوگون سے مدد لیجئے ۔ اور انھین کی مدد سے لکھنؤ والون کو
زیر کیجئے ۔ چنانچہ برہان الملک نے کاکوری مین قیام کر کے شیوخ کاکوروی کو اپنے
موافق بنا لیا ۔ انھین کی مدد اور رہبری سے آگے بڑھے اور یہ سن کے کہ
محمود نگر اور اکبر دروازے مین مقابلہ کا سامان کیا گیا ہے اصلی راستے سے
کٹرا کے مغرب کی طرف چل دئے ۔ گئو گھاٹ کے پاس دریا کے پار اُترے اور پار
کی طرف سے آہستہ آہستہ آکے اچانک مچّھی بھون پر اُمڑے اور مچّھی بھون
پر قبضہ کر لیا ۔ جب قبضہ ہو گیا تو کون دم مار سکتا تھا ۔ شیخزادون
کے تمام معزز لوگون نے آکے عاجزی سے سر جھکا دیا ۔ برہان الملک ہاتھی

---

ـــــہ ۔ رسالہ ۔ دلگداز ۔ جلد نمبر ۱۶ ۔ ماہ مارچ ۱۹۱۴ء

پر سوار ہو کے شیخن دروازے مین داخل ہوئے ۔ اور اس تلوار کو جو بڑے بڑے بہادرون کا سلام لے چکی تھی اپنی تلوار سے کاٹ کر گرا دیا ۔ اور شیخزادون سے مچھی بھون خالی کرنے کو کہا ۔ جب اُنھون نے بہانہ کرنا چاہا تو ایک ہفتہ کی مہلت دی ۔ اس مدّت مین شیوخ جو کچھ لے جا سکتے تھے اُٹھا لے گئے ۔ اور باقی پر برہان الملک کے سپاہیون نے قبضہ کر لیا ۔ جس وقت برہان الملک اودھ آئے تھے ۔ تو انھون نے اپنے خیمے آبادی سے دو کوس مغرب کی جانب دریائے گھاگرا مین بند ٹیلے پر نصب کروائے تھے ۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ایک خیمہ برسات گذارنے کی غرض سے تیار کروایا ۔ اُن کی طبیعت مین سادگی بہت تھی ۔ دوسرے اُن کو صوبے کے انتظامات سے ہی فرصت نہ ملتی تھی ۔ اس وجہ سے بھی اس طرف دھیان زیادہ نہین دے پاتے تھے ۔ جب برسات مین ان کو پریشانی ہوئی ۔ تو بنگلہ پر ایک چھپر ڈلوا لیا ۔ اس کے چارون طرف کچّی دیوارون کا حصار کھینچوا دیا اور اس کے چارون طرف قلعہ بندی کی شان سے کچّے برج بنوا دئے تاکہ گرد و پیش کی نگرانی بھی کی جا سکے یہ اتنا بڑا تھا کہ اس مین ایک وقت مین تمام پیادے اور سوار اور توپ خانے اصطبل اور دوسرے کارخانے سما سکتے تھے ۔ برہان الملک کی غیر معمولی مشغولیت اور سادگی کی وجہ سے ہی پکّے مکانات نہین بنے ۔ یہان تک کہ ان کی بیگمات کے رہنے کے لئے بھی جو مکانات تعمیر ہوئے وہ بھی کچّے ہی تھے ۔ جس وقت برہان الملک دورے یا سفر سے واپس آتے تو اپنے اسی بنگلہ مین آرام کرتے تھے۔

ان کو یہان کسی بھی تکلیف کا احساس نہین ہوتا تھا ۔

نواب برہان الملک چھ برس ہی اودھ اور لکھنؤ مین رہنے پائے تھے ۔ کہ ۱۱۶۷ محمّدی ۱۷۳۵ء مین نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کر دیا ۔ اور برہان الملک کو دھلی بلوا لیا گیا ۔ جس وقت برہان الملک دھلی گئے ۔ تو انھون نے لکھنؤ مین اپنے داماد صفدر جنگ کو جو اُن کے بھانجے بھی ہوتے تھے صوبہ کے انتظامات کے لئے چھوڑا ۔ اس وقت تک نادر شاہ دھلی مین لوٹ مار کر چکا تھا ۔ اور ابھی تک وہ وہین تھا ۔ کہ برہان الملک نے دھلی مین ہی وفات پائی ۔

برہان الملک نہایت بہادر، جوانمرد، حوصلہ مند، ایماندار، اور با وفا انسان تھے ۔ انھین جو کچھ ملا دلّی کے دربار سے ملا ۔ اور وہ اس دربار کی عزّت و وقار کے لئے آخر وقت تک لڑتے بھی رہے ۔

برہان الملک کے ایک بیٹا اور پانچ بیٹیان تھین ۔ بیٹا تو سن طفولیت ہی مین مر گیا ۔ بڑی صاحبزادی صدر جہان بیگم ( زوجہ نواب صفدر جنگ بہادر ) خانم صاحبہ کے بطن سے تھین ۔ ۲ ۔ نور جہان بیگم ( زوجہ نصیر الدین حیدر خان )۔ ۳ ۔ ھما بیگم (زوجہ نواب سعادت خان عرف سید محمّد خان پدر میر محمّد باقر عرف مرزا بندو )۔ ۴ ۔ محمّدی بیگم (زوجہ نواب محمّد قلی خان )۔ ۵ ۔ آمنہ بیگم ( زوجہ سید محمّد خان )۔ یہ بیٹیان بی بی صاحب کے بطن سے تھین۔

---

ـــــہ ۔ اردو شاعری کا سماجی پس منظر ۔ صـ۲۰۱ـہ

## مرزا مقیم ابوالمنصور بہادر صفدر جنگ ۔

مرزا مقیم کے جدِ امجد شاہ منصور مرزا ابن شاہ ناصر مرزا سربراہ مملکت تبریز تھے ۔ شاہ منصور کے لڑکے محمد قلی خان اُن کے لڑکے محمد جعفر خان بیگ اُن کے لڑکے محمد قلی خان بیگ ثانی تھے جن کے دو لڑکے تھے ۔ بڑے محمد شفیع خان بیگ اور چھوٹے جعفر قلی خان بیگ ۔ جعفر قلی خاں کی شادی سید امین نواب سعادت خان برہان الملک کی حقیقی بہن کے ساتھ ہوئی ۔ اُن سے دو لڑکے ہوئے بڑے مرزا محسن اور چھوٹے مرزا مقیم ۔ مرزا مقیم کی شادی برہان الملک کی بڑی لڑکی صدر جہان بیگم کے ساتھ ہوئی ۔ اِس طرح مقیم برہان الملک کے بھانجے بھی تھے اور داماد بھی ۔ مرزا مقیم چھ مہینے ہی کے تھے کہ اُن کی والدہ کا انتقال ہو گیا ۔ مرزا مقیم کو اُن کی خالہ نے اپنا دودھ پلا کر پرورش کیا ۔ مرزا مقیم اور اُن کے بڑے بھائی دونوں اپنی خالہ کے گھر مین جوان ہوئے ۔ مرزا محسن کا ۱۷۴۸ء مین انتقال ہو گیا ۔ مرزا مقیم کو برہان الملک کے عہد مین ہی محمد شاہ نے ابوالمنصور بہادر صفدر جنگ کا خطاب عطا کیا تھا [1]

برہان الملک کے انتقال کے بعد اُن کے بھتیجے شیر جنگ نے دعوائی کیا کہ مین برہان الملک کے بڑے بھائی کا بیٹا ہون ۔ اُن کی جا نشینی میرا حق ہے ۔ اسی مضمون کی ایک درخواست محمد شاہ

---

[1] ۔ تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ ۔ ص ۷۹

کو بھیجی ۔ ادھر برہان الملک کے وکیلِ خاص راجہ لچھمی نرائن پسر راجہ ہر نرائن نے ایک عرضی بادشاہ کو بھیجی کہ برہان الملک کو شیر جنگ کے ساتھ صفائی دل حاصل نہ تھی ۔ اگر صفائی دل حاصل ہوتی تو وہ اپنی لڑکی کی شادی صفدر جنگ سے نہ کرتے ۔ محمد شاہ بھی برہان الملک کی مرضی سے واقف تھے ۔ نادر شاہ نے بھی صفدر جنگ کی حمایت کی اور ۱۷۳۹ء مین صوبہ داری تفویض کی

صفدر جنگ کی ابتدائی زندگی نہایت پریشانی مین گزری ۔ نادر شاہ کے حملے کے سبب دلّی سلطنت کی حالت ابتر ہو گئی تھی امراء سلطنت مین مانی کر رہے تھے ۔ درباری سازشون نے بادشاہ کو بے دست و پا کر دیا تھا ۔ بادشاہ نے سیاسی اُلجھنون سے چھٹکارا پانے کے لئے عیش و عشرت کا سہارا لیا ۔ "میر تقی میر، حیات اور شاعری" مین لکھا ہے ۔

" بادشاہِ وقت کمزور کاہل اور عیش پرست تھا
اِس لیے امراء کو پوری آزادی تھی اور وہ
اپنی خود غرضیون اور ہوس پرستیون مین
گھرے ہوئے تھے ----------
محمد شاہی اُمراء مین ابوالمنصور صفدر جنگ
ممتاز حیثیت رکھتا تھا ۔ وہ ۳۵ برس کی عمر
مین سعادت خان برہان الملک کا جانشین
اور اودھ کا صوبہ دار مقرر ہوا اور رفتہ رفتہ

ایسی فوج جمع کرلی جس کی نظیر اس زمانہ مین
ملنا مشکل تھی " [1]

مرکز کمزور ہونے کی وجہ سے ہر طرف بد امنی کا دور دورہ تھا ۔ اودھ کی نائب صوبے داری کے عہدے پر مامور ہو کر صفدر جنگ نے برہان الملک کے زمانے مین ہی امورِ ملکی سے واقفیت حاصل کرلی تھی ۔ پھر جب ان کا دور شروع ہوا تو اس شہر کا نام فیض آباد ہو گیا ۔ صفدر جنگ نے اپنے پیش رو کی طرح اِس جگہ دارالامارت قائم رکھا ۔ بلکہ اس کو برہان الملک کے زمانے سے بھی زیادہ رونق عطا کی ۔ اگرچہ [2] صفدر جنگ کا عہد پر آشوب تھا ۔ لیکن فیض آباد کو ترقی کرنے کے کافی مواقع ملے ۔ اُنھون نے سیر و تفریح کے لئے باغ بنوائے شروع کئے ۔ پُر فضا مقامات تعمیر کروائے ۔ جس سے شہر کی رونق بڑھنے لگی ۔ اس بنگلہ کے ایک پھاٹک کا نام " دھلی دروازہ " تھا اور یہ دروازہ مغرب کی سمت کھلتا تھا ۔ اس دروازے کے باھر دیوان آتما رام کے لڑکون نے ایک پر رونق بازار بنوایا ۔ اور اپنے رھنے کے لئے یہان مکانات بھی تعمیر کرائے ۔ مچّھی بھون کو صفدر جنگ نے از سرِ نو تعمیر کرایا ۔ اور اس کو پھر سے دُرست کیا ۔ صفدر جنگ کو اپنی طاقت بڑھانے کا بھی عمدہ موقع ملا ۔

---

[1] ۔ میر تقی میر حیات اور شاعری ۔ ص ۱۰۷ ۔ ۱۰۸

[2] ۔ گزشتہ لکھنؤ ۔ ص ۵۶

لیکن صفدر جنگ پانچ ہی برس اپنے صوبے مین رہنے پائے تھے کہ دہلی مین ان کی طلبی ہوئی ۔ وہ راجہ نول رائے کو اپنی نیابت پر لکھنؤ مین چھوڑ کر دہلی چلے گئے ۔ نول رائے علم دوست، وقت کا پابند، جفاکش، بہادر، اور بہت بڑا منتظم تھا ۔ اور اس کے ساتھ اُسے خدا نے اپنے آقا کی سی سمجھ اور فیاضی بھی عطا کی تھی ۔ اس نے اِرادہ کیا کہ مچھی بھون کے سامنے دریا پر ایک پُل تعمیر کرائے ۔ بنیاد پڑی ہی تھی کہ اپنے آقا کے بلانے پر اس کو فوج لے کر احمد خان بنگش کے مقابلے کے لئے جانا پڑا ۔ اس مہم پر وہ بڑی فوج لے کر گیا ۔ مگر مارا گیا ۔ اور پُل کا کام جو چھیڑا تھا ناتمام پڑا رہ گیا ۔

۱۷۵۳ء مین نواب صفدر جنگ پھر لکھنؤ آئے اور مہندی گھاٹ پر آکر ٹھیرے ایک خاص مکان اپنے رہنے کے لئے بنوایا ۔ اور اس کی سجاوٹ اور سپاہ کی درستی مین مشغول ہو گئے ۔ لیکن تکمیل کی مہلت نہ ملی ۔ اسی سال سلطان پور کے قریب پاپڑ گھاٹ مین پڑاؤ تھا کہ ان کے ایک دنبل نکل آیا کوشش علاج کارگر نہ ہوا ۔ اُنھون نے ۵ اکتوبر ۱۷۵۴ء بمقام سلطان پور اِنتقال کیا ۔ لاش کو پہلے فیض آباد کی گلاب باڑی مین لے جا کے دفنایا گیا پھر تھوڑے دنون بعد ہڈّیان دہلی مین لے جا کے دفن کی گئین ۔ جن پر نہایت ہی عالیشان مقبرہ موجود ہے ۔ اور سیاحان ارض اسے آج تک عزّت کی نگاہ سے دیکھتے ہین ۔

صفدر جنگ نہایت با ہمّت شخص تھے ۔ رحمدلی کا یہ عالم تھا کہ کسی غریب آدمی کو دیکھتے یا کوئی غریب آدمی اُن سے ملنے آتا تو بعد ملاقات اُس کو پچاس اشرفیاں عطا کرتے اور یہی دستور ان کا ہمیشہ رہا [1] اور دوسری خاص بات یہ تھی کہ انھوں نے زندگی بھر اپنی بیاہتا بیوی کے سوا کسی دوسری عورت کا منہ نہیں دیکھا ۔

اُن کا دستوخوان وسیع تھا نہایت پر تکلف کھانوں کا اہتمام کیا جاتا تھا ۔ اس وقت کسی بادشاہ یا امیر کے ہاں یہ بات نہ تھی ۔ اپنی فوج کے ہر سپاہی کا خیال رکھتے تھے ۔ کسی پیادہ یا سوار کو مضمحل اور رنجیدہ دیکھتے تو اُس کی تنخواہ میں دس روپیہ کا اضافہ کر دیتے تھے۔ ۳۵ روپیہ سے کم کوئی سپاہی تنخواہ نہیں پاتا تھا ۔ سپاہ میں کسی کے ساتھ اِمتیاز نہیں برتتے تھے ۔ ایرانی، توانی، ہندوستانی، سب کے ساتھ یکسان سلوک کرتے ۔ اپنی رعایا کا بھی بہت خیال رکھتے ۔ مذہبی عصبیت ان میں بالکل نہیں تھی [2] وہ بلا تخصیص مذہب و مِلّت اپنے دوستوں سے وفاداری برتتے تھے ۔ اُن کی فوج ہندوستان کی بہترین تربیت یافتہ فوج تھی ۔ جس کی مثال اُس زمانہ میں ملنا مشکل تھی ۔ [3] صفدر جنگ نے

---

[1] ۔ تاریخ اودھ ۔ ص ۲۵۷

[2] ۔ بحوالہ بیگمات اودھ ۔ ص ۲۲۳

[3] ۔ لکھنؤ کی تہذیبی میراث ۔ ص ۵۸۵

ان کے زمانہ میں فیض آباد کو بڑی رونق حاصل ہوئی ۔ لکھنؤ کے جنوب میں جلال آباد میں قلعہ تعمیر کرایا ۔ اور شیخوں سے پنج محل لے کر انھیں[1] سات سو ایکڑ اراضی اس کے معاوضہ میں بمقام دوگا وال لکھنؤ میں دے دی۔ ان کی بنوائی ہوئی عمارت " گلاب باڑی " آج بھی فیض آباد کی زینت ہے۔ غرض صفدر جنگ کا اقتدار اس قدر بڑھ گیا کہ اودھ کا دلّی کے ساتھ تعلق برائے نام ہی رہ گیا ۔

---

[1] ۔ میر تقی میر ۔ حیات اور شاعری ۔ ص۸۰

## جلال الدّین حیدر نواب شجاع الدّین بہادر ۔

صفدر جنگ کے انتقال کے بعد اُن کے نامور شہزادہ شجاع الدّولہ ۱۷۵۳ء مین اودھ کے صوبہ دار مقرر ہوئے ۔ وہ ایک مضطرب اور بیقرار طبیعت کے الوالعزم فرمان روا تھے ۔ لیکن بد قسمتی سے اُن کا عہد بڑے بڑے فتنون سے اور یاد گار زمانہ انقلابون سے بھرا ہوا تھا ۔ دنیا کی دو زبردست تاریخی فوجون اور قوّتون کی قسمت کا فیصلہ انھین کی آنکھون کے سامنے ہوا ۔ پہلے پانی پت کی محشر انگیز لڑائی ہوئی ۔ جس مین احمد شاہ دّرانی ۔ شجاع الدّولہ اور نجیب الدّولہ کے ساتھ ثوانین روہیلکھنڈ کی زبردست فوجین ایک طرف تھین اور مرھٹون کا دَل دوسری طرف ۔ اِس لڑائی نے ۱۱۹۰ محمّدی ۱۷۶۱ء مین ایک ہی دن کے اندر یہ فیصلہ کر دیا کہ ہندوستان مسلمانون کا رہے یا نہ رہے مگر مرھٹون کا نہین ہو سکتا ۔ اس کے بعد بکسر کا قیامت خیز میدان گرم ہوا ۔ جس مین انگریزون کی باقاعدہ فوج ایک طرف تھی اور شجاع الدّولہ کا لشکر ایک طرف ۔ اس لڑائی نے جنگ پانی پت کے چار سال بعد ۱۱۹۳ محمّدی ۱۷۶۴ء مین چوبیس گھنٹہ کے اندر اس بات کا فیصلہ کر دیا کہ ہندوستان مسلمانون کا نہین انگریزون کا ہے ۔

....

---

تاریخ اودھ ۔ صـ۷۹ـہ

شجاع الدّولہ نے اپنی سکونت کے لئے فیض آباد کے بجائے لکھنئو کو منتخب کیا ۔ اور اگر کبھی فیض آباد آتے بھی تو ایک یا دو رات رہ کر گورکھپور یا بنارس کی طرف چلے جاتے تھے ۔ لیکن جب ۱۷۶۴ء میں انگریزوں سے بکسر کی لڑائی ہوئی اور شاہ عالم کے ساتھ شجاع الدّولہ کو بھی شکست ہوئی تو اس وقت شجاع الدّولہ بے سروسامانی کے عالم میں بھاگتے ہوئے فیض آباد آئے اور یہاں کے قلعے میں جو کچھ بھی سامان ملا اس کو لے کر راتوں رات لکھنئو پہنچے ۔ لکھنئو میں بھی اُنھوں نے صرف ایک رات قیام کیا ۔ اور جو کچھ ہاتھ آیا اس کو لے کر روہیلکھنڈ میں جاکر پناہ لی ۔ انگریزوں سے صلح اور معاہدہ ہونے پر اُنھوں نے فیض آباد ہی کو اپنا دارالحکومت بنا لیا ۔

شجاع الدّولہ نہایت ہی عادل اور مصنف مزاج حکمران تھے ۔ ان کے مخالفین تک ان کی سیاسی اور فوجی قابلیت اور اعلیٰ ہمتی کا لوہا مانتے تھے ۔ ان میں جانفشانی اور بیدار مغزی کے عناصر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے ۔ روز صبح و شام خود سیر کو نکلتے تھے ۔ اور سڑکوں و گلیوں کی درستی اور دکانوں کی حالت دیکھتے تھے ۔ مظلوموں کی خبر رکھتے اور ان کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کرتے تھے ۔

شجاع الدّولہ کو نئی نئی عمارتیں بنوانے کا بہت شوق تھا ۔ اُنھوں نے کئی شاندار عمارتیں بنوائیں ۔ اس کے علاوہ برہان الملک کے حصار کو دوبارہ سے ایک مضبوط شہر پناہ کے انداز پر تعمیر کرایا ۔ اس کے چاروں طرف دو دو میل کا میدان چھوڑ دیا گیا ۔ جس کے گرد گہری

خندق بنوائی گئی ۔ اور وہ ایک قلعہ کی صورت مین نظر آنے لگا ۔
عبدالحلیم شرر نے اپنی کتاب گزشتہ لکھنؤ مین لکھا ہے ۔ [1]

" جیسے ہی یہ خبر مشہور ہوئی کہ شجاع الدّولہ
نے فیض آباد کو اپنا مستقر قرار دیا ہے ۔ ایک
دنیا کا رخ آدھر پھر گیا ۔ ہزارہا آدمی آ آکے آباد
ہونا شروع ہوئے ۔ شاہ جہان آباد مین یہ حالت
تھی ۔ کہ جسے دیکھئے فیض آباد جانے کے لئے
تیار ہے ۔ چنانچہ دہلی کے اکثر باکمالون نے وطن
کو خیرباد کیا ۔ پورب کا رخ کیا ۔ شب و روز لوگون
کے آنے کا تانتا بندھا رہتا تھا ۔ قافلے پر قافلے
چلے آتے تھے ۔ جو آ آ کے یہان بستے اور فیض آباد
کے سوادمین کھیتے جاتے تھے ۔ چند ہی روز
مین ہر قوم و ملّت کے خوش باش اہل علم اہل سیف،
تاجر صنّاع اور ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگ
یہان جمع ہو گئے "

جہان شجاع الدّولہ کو نئی نئی عمارتین تعمیر کروانے کا شوق تھا ۔ وہین
شہر کو خوبصورت اور قرینے سے سجانے کا بھی شوق تھا ۔ خود جاتے اور

---

[1] ۔ گزشتہ لکھنؤ ۔ صـــ ۸ ـــ

دیکھ بھال کرتے جہان کچھ کمی یا خرابی دیکھتے اس کو دور کرواتے تھے ۔ اس کے علاوہ فوج کی اِصلاح بھی کرتے ۔ بازاروں کا ہر روز یہ عالم تھا ۔ کہ کوئی میلہ لگ رہا ہو ۔ ہر جگہ کا تاجر اپنا مال لا کر فروخت کرتا تھا ۔ ہر قیمتی اور اچھی چیز یہاں آسانی سے مل جاتی تھی ۔ لوگ عیش کی زندگی بسر کرتے تھے ۔

شجاع الدّولہ کو ان چیزوں کے علاوہ عورتوں سے بھی لگاؤ تھا ۔ رقص و سرور کی محفلوں سے گویا ان کو عشق تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ فیض آباد میں بازاری عورتیں بے شمار تھیں [1] جس وقت یہ سفر کو جاتے تو یہ عورتیں اُن کے ساتھ ہوا کرتی تھیں ۔ نواب کو دیکھ کر ان کے اُمراء اور سرداروں نے بھی یہی طریقہ اِختیار کر رکھا تھا ۔ اور ان لوگوں کے ساتھ بھی سفر میں رنڈیاں رہتی تھیں ۔

شجاع الدولہ نے صرف نو سال حکومت کی لیکن اس عرصہ میں انھوں نے فیض آباد کو جنت کا نمونہ بنا دیا تھا بقول احمد علی [2]

" شجاع الدّولہ کے مرنے سے اَوَدھ کی
وسعت کا ایک دور ختم ہو گیا ۔ کیونکہ
ابھی تک حکمرانان اودھ کی توجہ توسیع
مملکت ترقّی جاہ و منفعت اور اضافہ افتادہ

---

[1] ۔ گزشتہ لکھنؤ ۔ صفحہ

[2] ۔ مرقع اودھ ۔ احمد علی ۔ صفحہ

سلطنت پر تمام تر مصروف رہی تھی "

۱۷۷۵ء مین شجاع الدّولہ کا انتقال ہوا ۔ اور اُن کے ساتھ ہی فیض آباد کی چمک دمک بھی کم ہو گئی ۔

شجاع الدّولہ کے بارے مین میر تقی میر کا کہنا ہے ۔[1]

۔۔۔۔ ( خود شجاع الدّولہ ) اس جہان فانی
سے رخصت ہو گیا ۔ لوگون نے بہت ماتم
کیا ۔ اگر آسمان ہزار سال چکر کھائے تو
ایسا صاحب حرارت اور سراپا مروت سردار
پیدا نہ ہو گا "۔

شجاع الدّولہ کے بعد روہیلون نے دلّی سلطنت کو خوب لوٹا اور تباہ کیا ۔ جس طرح وزیر اعظم ہندوستان صفدر جنگ کی وفات کے بعد احمد شاہ بے عزّت اور ذلیل و خوار ہوا تھا ۔ اس سے کہین زیادہ شجاع الدّولہ کے بعد شاہ عالم [illegible] ہوا ۔

شجاع الدّولہ کی شادی اُمتہ الزہرا بیگم بنت مومن الدّولہ محمّد اسحاق خان بن غلام علی بن مرزا حسن شوستری سے

---

[1] ۔ میر تقی میر ۔ حیات اور شاعری ۔ صفحہ ۲۱۰

سے ہوئی تھی ۔ ان بیگم کو " بہو بیگم " کا خطاب سسرال سے ملا تھا ۔ اس کے علاوہ اور بہت سے عقد شجاع الدّولہ نے کیے ۔ اس لئے ان کی اولادین بھی بہت تھین ۔ ۲۴ بیٹے اور ۲۴ بیٹیان تھین ۔ ان مین آصف الدولہ بہو بیگم کے بطن سے تھے اور یہ بہو بیگم کے اکلوتے بیٹے تھے ۔ باقی شجاع الدّولہ کی اولادین اور بطنون سے تھین ۔ شجاع الدّولہ گلاب باڑی فیض آباد مین دفن ہوئے ۔ ۱۷۸۹ء مین ان کا مقبرہ تعمیر ہوا ۔

---

۔ تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ ۔ احمد علی خان ۔ ص ۱۰۳

## مرزا امانی نواب آصف الدّولہ بہادر ۔

نواب شجاع الدّولہ بہادر کی وفات کے وقت اُن کے تین بیٹے تھے اور رعایا کی نگاہون مین قابل اعتبار تھے ۔ سب سے بڑے مرزا امانی تھے جو بہو بیگم کے بطن سے تھے ۔ وہ باپ کے زمانہ مین ہی ولی عہدی کے لئے نامزد ہو چکے تھے ۔ اور باپ کی طرح علحیدہ دربار کرتے تھے ۔ باپ بیٹے کے درمیان ملکی انتظامات کے سلسلہ مین خط و کتابت ہوتی تھی ۔ دوسرے بیٹے مرزا سعادت علی خان یمن الدّولہ تھے ۔ جو باپ کی وفات کے وقت روہیلکھنڈ کے گورنر بنا دیئے گئے تھے ۔ تیسرے بیٹے نواب شہادت علی خان عرف مرزا جنگلی تھے ۔

بہرحال انّ کے بڑے بیٹے مرزا امانی ۱۷۷۵ء مین تخت پر بیٹھے اور اصف الدّولہ کہلائے ۔ اس وقت ان کی عمر ۲۷ برس کی تھی ۔ شجاع الدّولہ کی موت نے انگریزون کے لئے سلطنت اودھ مین راستہ صاف کر دیا ۔ جب تک وہ زندہ رہے ۔ انگریزون کی ایک نہ چلی ۔ ان کے مرتے ہی انگریزون نے آصف الدّولہ اور سعادت علی خان کے درمیان کشیدگی پیدا کرا دی ۔ آصف الدّولہ کی تخت نشینی سے اودھ کی تاریخ مین ایک جدید دور کی ابتدا ہوئی ۔ انھون نے مان سے ناراض ہو کر فیض آباد کو چھوڑ کر لکھنؤ کو اودھ کی راجدھانی بنا لیا ۔ البتہ انگریز اس کوشش مین لگے رہے کہ کسی طرح

---

تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ ۔ امجد علی خان ۔ صـ۵۵

سے ادوھ مین اپنے اقتدار کو بڑھائین چنانچہ وہ اسی کوشش مین لگے رھے کہ آصف الدّولہ کا ذھن فوجی اصلاح کی طرف سے ھٹا کر دوسرے مشاغل کی طرف لگا دین ۔ آصف الدّولہ خود بھی رزم سے زیادہ بزم کی طرف مائل تھے ۔ ان کی فیّاضی اور عیش پرستی ھی نے لکھنؤ کو ایک نئی زندگی عطا کی ۔ لکھنؤ کی شان و شوکت بے مثال ھو گئی ۔ آصف الدّولہ کی انھی خوبیون کی وجہ سے لوگون مین لکھنؤ آنے کا شوق پیدا ھو گیا ۔ فیض آباد مین جو فنکار اور اھل حرفہ جمع ھو گئے تھے ۔ وہ بھی اپنی قدردانی کی فکر مین وھان سے لکھنؤ پہنچ گئے ۔ دھلی کے لوگون کے قدم بھی لکھنؤ کی طرف اُٹھنے لگے۔ شعراء، دست کار، موسیقار، غرض یہ کہ ھر طبقہ کے لوگون کو آصف الدّولہ ھی کا دربار پسند آیا ۔ وہ روپیہ جس کا استعمال شجاع الدّولہ کے زمانے مین جنگ وغیرہ پر ھوتا تھا ۔ اسی روپیہ کو آصف الدّولہ نے اپنی عیش پرستی اور شہر کی زیبائش مین خرچ کرنا شروع کیا ۔ اُنھون نے اپنے دور مین کئی عمارتین اور محلّے تعمیر کرائے ۔ ان کی تعمیرات مین چند محل اور امام باڑے فن تعمیر کے اچھے نمونے سمجھے گئے ۔ یہ عمارتین نہایت مضبوط اور ایشائی طرز کی تھین ۔

آصف الدّولہ مین فوجی قابلیت بالکل نہ تھی ۔ اُنھون نے شجاع الدّولہ کی تیار کی ھوئی فوج مین بھی تخفیف کر دی تھی ۔ اور اس کے لئے کہا جاتا ھے کہ اس مین انگریزون کا بھی ھاتھ تھا ۔ یہ بھی قابل افسوس امر ھے کہ خودی جو ھر انسان مین تھوڑی بہت ضرور ھوتی ھے اس نام کی کوئی چیز آصف الدّولہ مین نہ تھی ۔

لیکن ان باتون کے باوجود آصف الدولہ مین رعایا پروری کا جذبہ بہت تھا ۔ ان کی فیاضی ہر طرف مشہور تھی [1] " جس کو نہ دے مولا اس کو دے آصف الدّولہ " لوگون کے زبان زد تھا ۔ عوام اور خواص ان کی عزّت کرتے تھے ۔ فیاضی کی وجہ سے ان کے دوسرے عیوب چھپ گئے تھے ۔ دولت ہر طرف برسنے لگی تھی ۔

لیکن آصف الدّولہ اخیر مین انگریزون کی چیرہ دستیون سے بہت تنگ آ گئے تھے ۔ اور اخرکار انھون نے ایک دن حکیم شفائی سے پوچھا کہ وہ کون سا عارضہِ خاص ہے جس مین حکیم لا علاج ہو جائے ۔ عرض کی کھانا کھانے کے بعد نہانا اور اس کی مداوت کرنا ۔ اس دن سے آصف الدّولہ نے ہر روز طعام کے بعد نہانا اس وقت تک جاری رکھا جب تک موت سے ہم آغوش نہین ہو گئے ۔ ۱۷۹۷ء مین آصف الدّولہ کا انتقال ہو گیا ۔

آصف الدّولہ کی شادی ۱۱۸۱ ھ مین شمس النساء بیگم دختر خان خانان خلف قمر الدین خان وزیر محمّد شاہ سے ہوئی تھی ۔ یہ شادی بھی زمانہ مین یادگار رہی ۔ اِس شادی مین ۲۴ لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا ۔ شمس النساء بیگم بھی آصفی امام باڑے مین شوہر کے پہلو مین ابدی نیند سو رہی ہین ۔ آصف الدّولہ کے دو لڑکے تھے ۔ وزیر علی خان اور رضا علی خان

---

[1] ۔ گزشتہ لکھنؤ ۔ ص۱۱۱

[2] ۔ تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ ۔ ص۱۱۵

آصف الدولہ نے اپنے بڑے بیٹے وزیر علی خان کی شادی اس شان سے کی تھی ۔ کہ اس زمانے میں ہندوستان میں شاید ہی کوئی شادی ہوئی ہو۔ رضا علی خان کی شادی آصف الدولہ کے چھوٹے بھائی نواب شہادت علی خان عرف مرزا جنگلی کی لڑکی سے ہوئی تھی ۔

آصف الدولہ کے انتقال کے بعد وزیر علی خان تخت نشین ہوئے ۔

## وزیر علی خان آصف جاہ ۔

وزیر علی خان اودھ کے پانچویں نواب تھے ۔ یہ بڑے دلیر بہادر اور شجاع تھے ۔ اس نواب نے اپنی قوتِ بازو، قوتِ عمل، اور سیاسی شعور سے امور سلطنت کو انجام دینے کا تہیہ کیا ۔ اور انگریزوں کی بے جا مداخلت، سیاسی جوڑ توڑ اور ملکی سرمایہ کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف قدم اٹھانے کا ارادہ کیا ۔ اپنے دربار کے ان اہل کاروں کے ساتھ بھی سخت رویہ اختیار کیا جو در پردہ انگریزوں کے آلہ کار تھے ۔ کیونکہ وزیر علی خان اپنے والد آصف الدولہ کی لاچاری اور بے بسی کی موت اور سیاسی بندشیں دیکھے ہوئے تھے ۔ اس سے پہلے ان درباری عہدہ داروں کی سازشوں سے چھٹکارا پانا ضروری سمجھا ۔ جنھوں نے انگریزوں کے اشاروں پر سازشوں کا جال بچھا رکھا تھا ۔

---

۱؎ ۔ سرشار ایک مطالعہ ۔ ص۱۳۔

۲؎ ۔ تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ ۔ ص۱۲۳۔

لیکن لوگون نے وزیر علی خان کو چین سے بیٹھنے ھی نہین دیا ۔ تحسین علی خان نے رزیڈنٹ سے نواب کی خوب برائیان کین ۔ اس پر عیاشی وغیرہ کے الزامات عاید کئے ۔ اور یہان تک کہہ دیا کہ یہ نواب آصف الدّولہ کی اولاد ھی نہین ھے ۔ اور جب ریزیڈنٹ نے ثبوت مانگا تو ریزیڈنٹ کی موجودگی مین کسی عورت کو محل خاص مین پردہ مین بٹھا کرکہلوایا۔ کہ ان کے کوئی اولاد ھوئی ھی نہین ۔ آصف الدّولہ اس قابل ھی نہین تھے۔

وزیر علی خان جب تک قید رھے ان کو قید مین بھی پریشان رکھا گیا ۔ کھانا کم ملتا تھا ۔ جوانی مین بخار رھنے لگا اور بھی کئی طرح کی بیماریون نے ان کو گھیر لیا ۔ انگریزون نے ان کو زندہ درگور کر دیا تھا ۔ سلہ اخر سترہ سال تین ماہ اور چار روز قید کی زندگی بسر کر کے ۳۶ سال کی عمر مین ۱۸۹۷ء مین تپ کے مرض مین انتقال کیا ۔ اور جس شخص کی شادی مین ۳۶ لاکھ روپیے صرف ھوئے تھے اس کو معمولی کفن ملا ۔ جنازہ سخت پہرے مین اٹھا ۔ وزیر علی خان کے بعد ان کی بیوہ اور بچّون کو نہایت قلیل گزارہ ملتا تھا ۔

---

سلہ ۔ تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ ۔ صـ۲۲۱ـہ

یمن الدّولہ نواب سعادت علی خان ۔

مرزا سعادت علی خان اودھ کی حکومت حاصل کرنے کے لئے ۲۳ سال بے قرار رہے ۔ لیکن اُن کا زمانہ بھی نہایت پر آشوب ثابت ہوا ۔ کہتے ہین مالی معاملات کو سمجھنے کے لئے سعادت علی خان نے ایک غیر معمولی دماغ پایا تھا ۔ یہ آصف الدّولہ کی نسبت چست اور کفایت شعار تھے ۔ اسی لیے لوگ ان کو طرح طرح سے بدنام کرتے تھے ۔ انھون نے رشوت اور ناجائز تحصیل بند کرا دی تھی ۔ مشہور ہے ۔ " از سعادت تابہ سعادت " یعنی سلطنت اودھ کا بہترین دور سعادت خان برہان الملک سے سعادت علی خان تک تھا ۔ اس کے بعد تو سلطنت فقط عیش و عشرت کا گہوارہ بن کر رہ گئی ۔

سعادت علی خان کے بعد غازی الدّین حیدر ۔ نصیر الدّین حیدر ۔ محمد علی شاہ ۔ امجد علی شاہ یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے ۔ یہ کمزور حکمران تھے ۔ نتیجہ یہ کہ رفتہ رفتہ انگریز اپنے پاؤن جماتے چلے گئے ۔ انگریزون نے ادھی سلطنت تو سعادت علی خان سے ہی چھین لی تھی ۔ اور نواب کے پاس جو آدھی سلطنت بچی تھی اس مین اس قدر رخنہ اندازی کی اور سازشون کا وہ جال بچھایا کہ اس

---

لہ ۔ تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ ۔ صلا۔

بچی کھچی سلطنت کو وہ بہ آسانی ہڑپ کر سکتے تھے ۔ ویلزلی نے تو نواب سعادت علی خان کی زندگی میں ہی پوری سلطنت کو ہڑپ کرنے کی کوشش کی تھی مگر نواب سعادت علی خان نے اُس کی اِس آرزو کو پورا نہیں ہونے دیا تھا ۔

## واجد علی شاہ ۔

واجد علی شاہ ۱۸۲۲ء مین پیدا ہوئے ۔ جس وقت اُن کے دادا محمّد علی شاہ تخت نشین تھے ۔ واجد علی شاہ کی عمر پندرہ سال کی تھی دادا کی ناجھوشی پر ان کو ناظم الدّولہ خورشید حشمت اور باپ کی تخت نشینی پر ابوالمنصور، ناصر الدین، سکندر جاہ، سلیمان حشم اور صاحب عالم کے خطابات ملے ۔ خود واحد علی شاہ ۱۲ فروری ۱۸۴۷ء کو تخت نشین ہوئے۔

واجد علی شاہ نے تخت پر بیٹھتے ہی پری خانہ بند کر دیا ۔ عیش و عشرت کی محفلین موقوف ہو گئین ۔ اور خود سلطنت کے کاروبار مین منہمک ہو گئے ۔ پری پورنا نند ورما لکھتے ہین ۔

" بادشاہ نے تخت پر بیٹھتے ہی سلطنت کے کامون مین تیزی کے ساتھ سخت محنت کرنا اور دلچسپی لینا شروع کر دیا ۔ وہ خود چھتر منزل مین رہنے لگے ۔ ان کا اصول تھا ۔کہ اپنے جنّت مکان کی یادگار مین ہر اتوار کو ۹ بجے صبح فرح بخش کی کوٹھی مین جاتے دفتر روز جاتے تھے پابندی کے ساتھ دوپہر تک دفتر کا کام دیکھتے تھے ہر ایک محکمہ کا افسر اَعلی دوپہر تک برابر اپنے کام پر موجود رہتا تھا ۔ عام رعایا کی شکایتین

جاننے کے لئے بادشاہ نے قانون بنایا کہ روزانہ
شام کو جب ان کی سواری نکلتی تھی دو توک
سپاہی اپنے سر پر چاندی کا صندوق لے کر
پیچھے پیچھے چلتے تھے ۔ اور ہر خاص و عام
کو اجازت تھی ۔ کہ وہ عرضداشت ان صندوقوں
میں ڈالتے جائیں ۔ اس صندوق کو " مشغلہ نو
شیروانی " کہتے تھے ۔ روز صندوق کھولے جاتے
تھے ۔ اور ان پر کاروائی ہوتی تھی " ؎

لیکن کمپنی کے عہدداران نے قدم قدم پر بادشاہ کے کاموں میں روڑے اٹکائے اور بادشاہ کے سلطنت کے کاموں میں اس انہماک پر ناراضگی کا اظہار کیا ۔ لیکن واجد علی شاہ نوجوان با ہمت اور سمجھدار تھا ۔ اس نے اودھ کی حکومت میں کئی سدھار کئے ۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اودھ کی ریاست کی اصلی بیماری کیا ہے ۔ جس بد قسمت واجد علی شاہ پر عیاشی کے اور دوسرے بیشمار جھوٹے اور گندے الزام لگائے گئے ہیں اس نے تخت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے اپنی رہی سہی فوج کو سدھارنے اور اسے پھر سے مضبوط کرنے کی زوردار کوششیں شروع کیں ۔ فوج کے ٹھیک ٹھیک نظام کے لئے اس نے کئی نئے اور کڑے قاعدے بنائے ۔ اور روز اپنے سامنے فوج سے قواعد کروانا شروع کی ۔

---

؎ ۔ واجد علی شاہ اور اودھ راج کا پتن ۔ صفحہ ۔ پری پور نانند ورما ۔

سورج نکلنے سے پہلے لکھنؤ کی ساری پلٹنون کو قواعد کے میدان مین جمع ہو جانا پڑتا تھا ۔ اور اس مین واجد علی شاہ بھی فوجی سپہ سالار کی وردی پہن کر گھوڑے پر سوار ہو کر میدان مین پہونچ جاتے تے ۔ اگر کسی بھی پلٹن کے آنے مین دیر ہو جاتی تھی تو اس پر دو ہزار روپئے جرمانہ ہوتا تھا اور یہ جرمانہ وصول کر لیا جاتا تھا ۔ دوپہر تک ساری پلٹنین قواعد کرتی تھین ۔ اور واجد علی شاہ بھی گھوڑے پر سوار دوپہر تک قواعد کے میدان مین خود موجود رہتے تھے ۔ لیکن کمپنی کے نمائندون کو اودھ کے بادشاہ کی یہ باتین پسند نہ آئین ۔ طرح طرح سے ان کو پریشان کیا گیا ۔ اور ان پر زور ڈال کر اس کام سے روکا گیا ۔ یہان تک کہ واجد علی شاہ کو مجبور ہو کر قواعد کے میدان مین جانا بند کر دینا پڑا ۔

[1] واجد علی شاہ نہایت مہذب، نرم مزاج اور رحمدل انسان تھے ۔ وہ متعصب بالکل نہین تھے ۔ کسی شخص کا اپنے مذہب سے خوش عقیدگی رکھنا کوئی عیب نہین ہے ۔ اور پھر بادشاہ مذہب کے معاملے مین جیساکہ کہا جاتا ہے بہت سخت اور کٹر تھے لیکن اگر ایسا ہوتا تو وہ رقص موسیقی اور ڈرامہ کی قدردانی اور سرپرستی نہ کرتے کیونکہ اسلام مین یہ سب چیزین کب جائز ہین [2] واجد علی شاہ سر سے پاؤن تک پکے ہندوستانی تھے ۔

---

[1] ۔ گزشتہ لکھنؤ ۔ ص۱۱۱

[2] ۔ تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ ۔ ص۱۱۱

انھین فنون لطیفہ سے بڑی دلچسپی تھی ۔ مصوری ۔ معماری ۔ باغ بانی ۔ شاعری، موسیقی مین ان کو کافی دست گاہ تھی ۔ مولانا شرر کا کہنا ہے ۔

" دنیا مین عمارت کے شوقین ہزارون بادشاہ گذرے ہین مگر غالباً اپنی ذات سے کسی تاجدار نے اتنی عمارتین اور اتنے باغ نہ بنوائے ہونگے جتنے واجد علی شاہ نے اپنی نہ کام زندگی اور برائے نام شاہی کے مختصر زمانے مین بنائے شاہجہان کے بعد اس بارہ خاص مین اگر کسی کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ اسی ستم زدہ شاہ اودھ کا نام ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی خاص عمارت سیکڑون ہزارون سال تک باقی رہی اور کسی کی صدھا عمارتین زمانے نے چند ہی روز مین مٹا کے رکھ دین "۔

" عمارت کے علاوہ بادشاہ کو جانورون کا شوق تھا ۔ اور اس شوق کو بھی انھون نے اس درجے تک پہونچا دیا کہ دنیا اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے ۔ اور شاید کوئی شخص آج تک اس کے نصف درجے کو بھی پہونچ سکا ہوگا سکیگی ۔

سانپون کے رکھنے کا اِنتظام اس سے پہلے شاید
کہین نہ کیا گیا ہو گا ۔ اور یہ خاص واجد علی
شاہ کی ایجاد تھی جس کو یورپ کے سیاح حیرت
سے دیکھتے اور اس کی تصویرین اور شرح کیفیت
قلم بند کر لے جاتے تھے "

لیکن واجد علی شاہ پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے ۔ اور آخر مین واجدعلی شاہ خود اِن الزامات کو دیکھ کر حیران رہ گئے انھون نے کبھی سوچا بھی نہ تھا ۔ کہ ان کی سلطنت بلکہ ان آباواجداد کی سلطنت پر کمپنی یون ڈاکہ ڈالے گی ۔ کمپنی نے دولت کا لالچ دے کر لوگون کے ضمیر خرید لئے تھے۔ زیادہ تر لوگ مطلب پرستی پر وطن پرستی کو نثار کر رہے تھے ۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات مین واجد علی شاہ انگریزون سے لڑکر لکھنؤ کو تباہ اور مسمار کرنا نہین چاہتے تھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سلطنت سے ہی دستبردار ہوگئے اور کلکتہ کا سفر دل خراش برداشت کیا ۔

کلکتہ مین نظر بند رہنے کے باوجود اس بادشاہ نے بڑے کارہائے نمایان انجام دیئے ۔ کلکتہ کے ایک غیر آباد مقام کو ایسا آباد کیا ۔ کہ دوسرا لکھنؤ بن گیا ۔ مٹیا برج کلکتہ کو ایسا بنا دیا کہ پرانے لکھنؤ کا ہی ایک محلہ معلوم ہونے لگا ۔ وہی تہذیب و تمدن اور وہی گفتار ورفتار ۔

---

لہ ۔ گزشتہ لکھنؤ ۔ صـ۸۲ ۔ ۸۳

واجد علی شاہ کی پہلی شادی ۱۸۳۷ء میں نصیر الدّین حیدر شاہ کے عہد میں نواب علی خان ( وزیر اعظم ) کی بھتیجی نواب عالم آرا بیگم کے ساتھ ہوئی تھی ۔ عالم آرابیگم کو نواب اعظم بہو کا خطاب سسرال سے ملا تھا ۔ مگر اب نواب خاص محل کے لقب سے مشہور ہوئیں ۔ موصوفہ کو شعروسخن سے بھی ذوق تھا ۔ عالم تخلّص کرتی تھیں ۔ ایک دیوان موسومہ " بیاض عشاق " اور ایک مثنوی " مثنوی عالم " ان کی یادگار ہیں ۔[1] اس محل کے علاوہ واجد علی شاہ کی ساتھ ستر بیویاں اور تھیں ۔

انگریزوں نے واجد علی شاہ کو کلکتہ لے جاکر بند کردینے اور اودھ پر قبضہ کرلینے کے بعد بھی واجد علی شاہ کا پیچھا نہیں چھوڑا ۔ انگریزوں نے ان تمام معاہدوں کے خلاف ورزی کی تھی جو کمپنی اور فرمان روایان اودھ کے درمیان ہوئے تھے ۔ اس لیے انگریزوں نے اپنے کالے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے طرح طرح کے الزامات واجد علی شاہ پر تھوپ دیے ۔ اور ہندوستان کی تاریخ کو مسخ کیا ۔ اس کار خیر میں انگریز مورخین تو پیش پیش تھے ہی لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ خود ہندوستانی مورخین بھی انگریزوں سے پیچھے نہیں رہے ۔

---

[1] ۔ بیگمات اودھ ۔ ص ۲۱۸

# " باب دوم "

## " فسانہ آزاد میں اعلیٰ، متوسط اور نچلے طبقہ کی زندگی "

لکھنئو کی شہرت و عظمت تمام تر شاہان اودھ کی مرہونِ منت ہے ۔ جن کے شاہانہ تزک و احتشام اور رنگین مزاجیون نے اسے تاریخی اہمیت کے ساتھ افسانوی شہرت بھی عطا کی ۔ اُمراء اور نوابین کی فیاضیون نے عوام کے دلون مین عجیب عجیب خوش اعتقادیان پیدا کر دین ۔ اس کی افسانوی شہرت اس کی تاریخی اہمیت پر غالب آ گئی ۔ اور تاریخ کا لکھنئو کہانیون کے لکھنئو مین گم ہو گیا ۔

نوابون کے اس لکھنئو کی تاریخ دو حصّون مین بیان کی جا سکتی ہے ۔ شجاع الدّولہ نے اس کو معمولی بستی سے ترقی دے کر شہر بنا دیا اور آصف الدّولہ نے اس کے حسن مین نکھار پیدا کیا اور واجد علی شاہ نے اس نکھار کو دو اتشہ کر دیا ۔

پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء مین لڑی گئی اور اس جنگ مین میدان انگریزون کے ہاتھ رہا ۔ ہندوستان پر ان کا مکمل قبضہ ہو گیا ۔ شروع شروع مین تو انگریزون نے مسلمانون کے ساتھ وہی سلوک کیا جو غالب قوم مغلوب قوم کے ساتھ کرتی ہے ۔ اودھ کا معاملہ ذرا مختلف تھا وہان نوابین پر وہ تباہی نہین آئی جو دھلی مین آئی تھی ۔ وہان اب بھی نوابون کا ٹھاٹ باٹ بڑی حد تک باقی رہا ۔ ان نوابون کا کام صرف کھانا اور داد عیش دینا تھا ۔ رہ گیا ملکی بہبود کا سوال تو اس کو انگریز

انجام دے لیتے تھے ۔ فسانہ آزاد ایسے ہی دور کی نمائندگی کرتا ہے ۔
نوابوں اور جاگیرداروں کو اب بھی طرح طرح کے
تماشوں رقص و سرور کی محفلوں قسم قسم کی بازیوں، میلوں، ٹھیلوں سے خاص
دلچسپی تھی ۔ اور نوابوں جاگیرداروں کے ساتھ عوام بھی انہی چیزوں کا
شوق رکھتے تھے گویا ان میں برابر کے شریک تھے ۔ اب وہ تفریح کے کیا
سامان تھے ان پر ایک نظر ڈالنی ہے ۔

## جانوروں کا لڑانا ۔

جانوروں کو آپس میں لڑانا لکھنؤ کے لوگوں کا ایک محبوب مشغلہ تھا ۔ جانوروں کو لڑاکر وہ داد طلب کرتے تھے ۔ گزشتہ لکھنؤ میں عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں ۔

" جب لوگوں کو ملک گیری و صف آرائی سے فرصت ملی اور میدان جنگ میں کھڑے ہونے کا حوصلہ نہ رہا تو جنگجوئی کے جذبات نے جانوروں کو لڑا لڑا کے جانبازی و خون ریزی کا تماشا دیکھنے کا مشغلہ پیدا کیا " ۔ [1]

نوابوں جاگیرداروں اور امیروں نے اپنے اس شوق کو دو طرح سے پورا کیا ۔ درندوں کی جنگ کا تماشا دیکھ کر اور پرندوں کو لڑا کر ۔

شیروں کو آپس میں خوب لڑاتے اور داد طلب کرتے تھے ۔ اکثر شیروں کو تیندوں سے لڑایا جاتا تھا ۔ اور یہ تیندوے ایسے بہادر ہوتے تھے کہ ان کے سامنے شیروں کو ہمیشہ شکست کا منہ دیکھنا پڑتا ۔ نصیرالدین حیدر کے زمانے میں ایک گھوڑے کے مقابلے میں شیر کو لایا گیا وہ گھوڑا ایسا بہادر تھا کہ اس نے شیر پر ایسے وار کئے کہ شیر پیچھے ہٹ گیا جب مقابلے کے لئے دوسرے شیر لائے گئے تو انھوں نے گھوڑے کی جانب رخ نہیں کیا ۔ اور میدان چھوڑ کر بھاگ گئے ۔ اسی طرح ہاتھی چیتا

---

[1] ۔ گزشتہ لکھنؤ ۔ عبدالحلیم شرر ۔ ص ۱۶۳

اونٹ، گھوڑا، بارہ سنگھا، مینڈھا، سہی کو لڑایا جاتا تھا اور نوابین و جاگیردار لڑائی کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے ۔ جس امیر کا جانور بہادری دکھاتا تھا ۔ پورے میدان مین تالیون کا شور بلند ہو جاتا ۔ دن رات لکھنؤ مین ایسے ہی تماشے ہوا کرتے تھے ۔ اور ان بلند مرتبہ لوگون کے ساتھ ان کو خوش کرنے کے لئے عوام بھی جمع رہتے تھے ۔ کیونکہ عوام خود تو ایسے کھیل کر نہین سکتے تھے نہ ان کے پاس ایسے بہادر اور بیش قیمت جانور تھے اس لئے وہ صرف تماشائی کی حیثیت سے ان ہنگامون سے لطف اندوز ہوتے تھے ۔ البتہ پرندون کی لڑائی ضرور ایسی تھی کہ اس مین خاص و عام دونون حصہ لے سکتے تھے ۔ لوگ ان پرندون کو پال کر اور لڑائی کے لئے خوب تیار کر کے، درباروں مین لے جاتے۔ پھر نوابون کے سامنے لڑائی ہوتی تھی ۔ نواب خوشی سے ان کھیلون مین شرکت کرتے اور جس کی جیت ہوتی اس کو گران قدر انعامات دیئے جاتے تھے ۔

## بازیان ۔

### کبوتر بازی ۔

جانورون کو جس طرح آپس مین لڑایا جاتا تھا اسی طرح پرندون کو بھی لڑایا جاتا ۔ واجد علی شاہ کے بارے مین عبدالحلیم شرر لکھتے ہین ۔ [1]

" ایک بڑا عملہ کبوتر بازون کا تھا جس کی تعداد

---

[1] ۔ گزشتہ لکھنؤ ۔ عبدالحلیم شرر ۔ ص ۱۶۳

دو سو کے قریب ہوگی ۔ داروغہ کبوترخانہ
داروغہ عباس علی خان نامی ایک عجیب بزرگ
تھے ۔ ان کا مکان عمارات شاہی کے حدود
سے باہر ایک تالاب کے کنارے واقع تھا ۔
اس پر پچیس تیس گز کے فاصلے تک مچان
باندھ کر ایک چوبی بنگلہ بنایا گیا تھا ۔
جس میں ان کی نشست رہتی تھی "[1]

میر عباس کبوتر باز کو جب دربار میں بلایا جاتا تو یہ اپنی کابک لے کر جاتے تھے اور اشارہ کرتے ہی کبوتر اُڑا دیتے پھر جب سیٹی دیتے توسارے کبوتر اپنی کابک میں واپس آ جاتے تھے ۔ اُمرا بھی اپنے یہاں کئی کئی سو کی تعداد میں کبوتر رکھتے تھے ۔ اور ان کو اڑاتے تھے ۔ ان کبوتروں کی کابکیں طرح طرح کی ہوتی تھیں ۔ ان کے دانے اور صفائی کا خاصا خیال رکھا جاتا تھا ۔ ان کی دیکھ بھال کے لئے علحیدہ ملازم ہوتے تھے ۔

[2] ۔ کبوتر بازوں کے عجیب و غریب واقعات بھی مشہور ہیں ۔ نواب غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے زمانے میں ایک شخص نے دوھریا کبوتر بنایا ۔ اس نے دو کبوتروں کے پٹھے لے کر ایک کا دایاں اور دوسرے کا بایاں بازو ...

---

[1] ۔ گزشتہ لکھنؤ ۔ ص۶۳

[2] ۔ جان عالم ۔ عبدالحلیم شرر ۔ ص۵۴

کاٹا اور کٹے ہوئے دونون بازؤن کو ٹانکے لگا کر دوھریا کبوتر بنا دیا پھر اس احتیاط سے اس کو پالا کہ وہ خوب بڑا ہو گیا اور اس کو اُڑانے لگے ۔

میر امان علی خان نے یہ کمال پیدا کیا تھا کہ کبوتر کو رنگ لیا کرتے تھے اور جس طرح چاہتے ان کے پر اکھاڑ کر دوسرے رنگ کے پر اسی طرح جما دیتے کہ مصنوعی نہ معلوم ہوتے تھے ۔ ان پرون کے رنگ خراب نہین ہوتے تھے ہان جب زمین پر کبوتر گر جاتا تو اصل رنگ نکل آتا تھا ۔ ان کبوترون کو لوگ پندرہ پندرہ بیس بیس روپے مین خریدتے تھے ۔ مٹیا برج کی نظر بندی کے زمانے مین بھی جان عالم کے پاس بہت سے کبوتر اچھی نسل کے تھے ۔[1] جب جان عالم کا انتقال ہوا تھا تو ان کے پاس چوبیس ہزار سے زیادہ کبوتر تھے ۔ اور ان پر سیکڑون کبوتر باز ملازم تھے ۔

---

[1] ۔ گزشتہ لکھنؤ ۔ عبدالحلیم شرر

مرغ بازی ۔

لوگون کو حیوان اور جانور اور پرند لڑانے اور اڑانے کا شوق تھا ۔ وہان مرغون کو بھی آپس مین لڑایا جاتا تھا[1] ۔ مرغون مین اصیل سب سے زیادہ اہم ہوتا تھا ۔ اس سے زیادہ کوئی اور بہادر نہین تھا ۔ شہر مین بھی اصیل مرغ جیسی بہادری نہین ہوتی تھی کیونکہ خواہ یہ مر جاتا لیکن اخیر وقت تک میدان نہین چھوڑتا تھا اور لڑائی سے منہ نہین موڑتا تھا

مرغون کے لڑانے کا طریقہ یہ تھا کہ ان کی چونچون کو باندھ دیا جاتا تھا ۔ تاکہ ان کی چونچون کو کوئی ضرر نہ پہونچے ۔ لیکن لڑائی سے پہلے چونچون کو چاقو سے چھیل کر تیز اور نوکیلی کر دیتے تھے ۔ اور پھر ان کو پانی مین چھوڑ دیتے تھے ۔ دونون مرغون کے مالک ان کے پیچھے رہتے تھے اور ان دونون کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ حملہ کرنے مین پہل ہمارا ہی مرغ کرے ۔ دونون مرغ چونچون اور لاتون سے آپس مین لڑنا شروع کر دیتے اور مرغ باز اپنے اپنے مرغون کو جوش دلانے کے لئے آوازین لگاتے اور ان کی آوازون کو سن کر مرغون مین اور زیادہ جوش پیدا ہو جاتا ۔ آوازین برابر گونجتی رہتی تھین ۔ ہان بیٹا مار واہ میرے شیر شاباش ہمّت نہ ہار وغیرہ وغیرہ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرغ اس رجز خوانی کو سن رہے ہین ۔ اگر ان دونون مین سے کوئی ایک زخمی ہو کر گر جاتا تو پھر اس کو اٹھا لیتے[2] ۔

---

[1] ۔ گزشتہ لکھنؤ ۔ ص ۱۷۵

[2] ۔ اٹھانا مرغ بازون کی اصطلاح مین پانی کہلاتا ہے ۔

مرغ باز اپنے مرغ کے سر پر پانی ڈالتے اور خون صاف کرتے ان کے زخمون کو اپنے منہ سے چوستے تھے ۔ اس طرح کرنے سے تھوڑی ھی دیر مین مرغ پہلے ھی کی طرح تروتازہ ھو کر آمادۂ جنگ ھو جاتا ۔ مرغون کی لڑائی کئی کئی دن اسی طرح جاری رھتی تھی ۔ جو مرغ لڑنے کے قابل نہ رھتا بس سمجھ لیا جاتا کہ یہ ھار گیا ۔ اگر کسی مرغ کی چونچ ٹوٹ جاتی تو ھر ممکن کوشش کر کے اس کی چونچ باندھتے اور اس کو لڑاتے تھے ۔

لڑائی کے لئے مرغون کو کافی محنت سے تیار کیا جاتا تھا ۔ ان کی غذا کا خاص خیال رکھا جاتا تھا ۔ ان کے اعضا کی مالش ھوا کرتی تھی ۔ چونچ کو تیز اور خار دار بنا کر اس طرح سے باندھ دیا جاتا تھا کہ زمین پر دانہ چگتے وقت کہین چونچ ٹوٹ نہ جائے ۔ بلکہ اس کو زیادہ تر دانہ ھاتھ پر رکھ کر کھلایا کرتے تھے ۔

مرغون کی لڑائی کا شوق نواب شجاع الدّولہ سے لے کر اخیر وقت تک رھا ۔ آصف الدّولہ سعادت علی خان مرغ بازی کے شوقین تھے ۔ اور ان کے شوق نے سوسائٹی پر بھی اثر ڈالا ۔ نوابون اور امیرون کے علاوہ عوام کو بھی اس کھیل کا شوق تھا ۔ یہان تک کہ یورپ کے لوگ جو یہان تھے وہ بھی یہ شوق رکھتے تھے ۔ چنانچہ جنرل مارٹن[1] اعلیٰ درجہ کے مرغ باز تھے ۔ اور نواب سعادت علی خان سے بازی لڑایا کرتے تھے ۔

---

1 ۔ گزشتہ لکھنو ۔ صفحہ ۱۷۷

ان کھیل تماشون کو میر نے اصف الدولہ کے زمانے مین اپنی آنکھ سے دیکھا تھا ۔ ان کی مثنوی " مرغ بازیان " مین اس زمانہ کی تصویر ملتی ہے جب نواب آصف الدولہ کی عملی قوت اور تعمیری کام کی صلاحیت معطل ہو چکی تھی ۔ اور جیسے بٹیر لڑانے افیون کھانے اور ٹوپان اُچھالنے کے علاوہ اور کوئی دوسرا کام نہ رہ گیا تھا ۔ میر اس معاشرہ کے زوال سے ناخوش تھے ۔ اس لئے انھون نے اس کھوکھلے پن پر گہرا طنز کیا ہے مثلاً [1]

دلی سے ہم جو لکھنؤ آئے — صحرا برفاش مرغ بان پائے
جمع منگل کو پالی کی ہے دھوم — گلیون مین روز حشر کا ہے دھوم
مرغ بازون کو ہے قیامت جوش — جس کو دیکھ تو مرغ در آغوش
مرغ لڑتے ہین ایک دو لاتین — سینکڑون ان سفیہون کی باتین
ان نے پر جھاڑے یہ پھڑکنے لگے — ان نے کی نوک یہ کڑکنے لگے

---

[1] ۔ رسالہ نیا دور ۔ لکھنؤ ۔ گھی ناتھ نارنگ کا مضمون ۔

بٹیر بازی ۔

یہ شوق پنجاب سے لکھنؤ مین آیا ۔ بٹیر کی دو قسمین ہوتی ہین ۔ پہلی گھاگس[1] اور دوسری چنتگ[2] ۔ گھاگس بٹیر چنتگ سے زیادہ طاقت ور اور بڑا ہوتا ہے ۔ چنتگ گھاگس سے چھوٹا اور نازک ضرور ہوتا ہے لیکن لڑنے مین گھاگس سے زیادہ تیز ہوتا ہے ۔ اس کی لڑائی بڑی دلکش اور شاندار ہوتی ہے ۔ لکھنؤ مین ان دونون کی لڑائی دیکھنے مین آتی تھی ۔ فسانہ آزاد مین ہے ۔

"۔۔۔۔ پرسون اے پرسون تو ففقور چین بھی یاد فرمائین تو بندہ نہ جائے گا ۔ پرسون نواب صاحب کے ہان بٹیرون کی پالی ہے ۔ مہینون سے بٹیر تیار کیئے ہین ۔ دو دو پنجے تو کسالین ادھر یا ادھر دیکھیئے تو میری ٹوری کیسی بڑھ بڑھ کے لات دیتی ہے ۔ کہ آچھے اچھے بٹیر ایک ہی منہ مین نوک دم بھاگین "۔

ان کی لڑائی کے لئے میدانون کی ضرورت نہین ہوتی تھی ۔ بلکہ کمرون مین ہی فرش پر یہ لڑائیان ہوتی تھین ۔ لوگ بڑی دلچسپی اور تکلف کے ساتھ بیٹھ کر ان کی لڑائی دیکھتے تھے ۔ اسی وجہ سے نوابی دور مین اس کو

---

[1] ۔ فسانہ آزاد ۔ ص۱۳۱ ۔ جلد اول

بہت پسند کیا جاتا تھا ۔ پہلے تو بٹیروں کو پانی مین بھگو کر روز روز خوب ہاتھ سے دبایا جاتا تھا ۔ اس سے دو فائدے ہوتے تھے ایک تو انکی وحشت دور ہو جاتی تھی اور دوسرے وہ چونچین مارنے اور چیخنے لگتے تھے ۔ پھر انھین دست آور اجزاء دیتے تھے جن مین مصری زیادہ ہوتی تھی تاکہ ان کا جسم سبک ہو جائے ۔ پھر آدھی رات کے قریب ان کے کان مین چلا کر "کو" کہا جاتا تھا ۔ جس کو کوکنا کہتے ہین ان تدبیرون سے ان کے جسم کی ساری چربی چھٹ جاتی اور بھدّا پن دور ہو جاتا ۔ جس بٹیر مین یہ تمام باتین پیدا ہو جاتین وہی اچّھا بٹیر سمجھا جاتا تھا ۔ اور خوب لڑتا بھی تھا ۔ لڑائی کے وقت فرش پر چارون طرف دانہ ڈال دیتے تھے ۔ پھر بٹیر کو چھوڑ دیا جاتا تھا ۔ مرغون کی طرح سے بٹیرون کی چونچین بھی چاقو سے چھیل کر خاردار بنائی جاتی تھین اور لڑائی بھی مرغ سے ملتی جلتی ہوتی تھی ۔ بٹیر اپنی چونچ سے اپنے دشمن کو مارتا اور اس کے منہ کو نوچ لیتا تھا اور کبھی اپنے دشمن کا پوٹا تک پھاڑ دیتا تھا ۔ ان کی لڑائی مرغون کی طرح سے کئی کئی دن تک جاری نہین رہتی تھی ۔ بلکہ صرف پندرہ بیس منٹ تک رہتی تھی ۔ جو زخمی ہو جاتا یا ہار جاتا وہ میدان سے بھاگ کھڑا ہوتا اور پھر کبھی کسی بٹیر کے مقابلہ مین نہین لایا جاتا تھا ۔ بڑے اُمراء اور نواب بٹیرون کو پالتے اور لڑائی کے لئے تیار کرواتے تھے ۔ فسانہ آزاد کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو ۔

"کہ اتنے مین نواب صاحب نے کہا کیون آزاد
کبھی بٹیرین بھی لڑائی ہین ۔ نیت شب بخیر اب کی
ربیع الاول مین وہ گھمسان کی لڑائیان دکھائین

کہ واہ جی واہ ۔
صاحب ۔ میان آزاد تم تو اپنے کو بڑا جہانیان
جہان گشت سمجھتے ہو ۔ مگر واللہ یہ لڑائی
نہ دیکھی ہوگی ۔ اس طرح گتھ جاتے ہین کہ
توبہ ہی بھلی ۔ بٹیر کی لڑائی کے اگے توتوپ
و تفنگ بھی گرد ہے ۔ اور پھر ہمارے نواب صاحب
کے یہان کی پالیان ۔ اف فوہ آج ہماری سرکار
مین جتنے بٹیر ہین اتنے تو مٹیا برج کے چڑیاخانے
مین بھی نہ ہون گے ایک ایک بٹیر ہزار ہزار کی
خرید کا ۔ نوک دم کے بنانے مین توڑے کے توڑے
صرف ہو گئے ۔ سیرون موتی مروارید تو مین نے اپنے
ہاتھون پیس کر کھلا دیئے ہین ۔ کچھ دنون روز
کھرل چلتا تھا ۔ مگر واللہ آپ بھی کہین گے کہ
ہم آدمی ہین ۔ اس ڈیوڑھی پر اتنے دن سے ہو
اب تک بٹیر خانہ بھی نہ دیکھالیے آؤ چلو تم کو
سیر کرائین ۔ یہ کہہ کر بٹیر خانہ لے گئے ۔
میان آزاد کیا دیکھتے ہین کہ جوطرفہ کابکین ہی
کابکین نظر آتی ہین ۔ اور کابکین بھی وہ بیش‌بہا

کہ اہو ہو ہو ۔ ہاتھی دانت کی تیلیان ۔ ان پر
گنگا جمنی مگزیان اور کار چوبی چھتین اور مقیش کی
جھالر اس پر کامدار مخملی غلافین ۔ رنگ برنگ سونے
چاندی کی ننھی ننھی کٹوریان جس مین بٹیر اپنی
پیاری پیاری نکیلی چونچون سے پانی پئین ۔ پانچ پانچ
چھ چھ سو کی لاگت کی کابکین ہر سمت ٹنگی ہین ۔
کھوٹیان بھی رنگ برنگی صاحب ایک ایک کابک اتار کر
بٹیر دکھا کر تعریف کرنے لگے تو پل باندھ دیئے ایک
بٹیر کو دکھا کر کہا کہ اللہ رکھے کیا منجھولا جنور
ہے ۔ صف شکن جو آپنے سنا ہو ۔ یہی حضرت ہین
لندن تک خبر کے کاغذ مین اس کا حال چھپ گیا
میری جان کی قسم ذری اسکی آن بان کو تو دیکھیے گا
( بوسہ لیکر ) ہائے کیا بانکا بٹیر ہے یہ نواب صاحب
کے دادا جان کے وقت کا ہے ۔ ایسے رئیس پیدا
کہان ہوتے ہین دم کے دم مین لاکھون پھونک دیئے ۔
روپیہ تو ٹھیکریان سمجھا کیئے ----------
چار سال کی دلگی سنیئے ۔ نواب صاحب کے مامون تشریف
لائے ان مین بھی ریاست کی بُو ہے ۔ کنکوّا تو ایسا
لڑاتے ہین کہ میان ولائتی ان کے آگے پانی بھرین

دو دو تولے افیم پی جائیں اور وہی خم و دم ۔
بٹیر بازی کا بھی پرلے سرے کا شوق ہے ۔ آپ کا
ظفر پیکر تو بلا کا بٹیر ہے ۔ بٹیر کیا شیدی لندھور
ہے ۔ ڈھوہ کا ڈھوہ ۔ جیسے خاصا چھوٹا تیتر ۔
خیر آتے ہی نواب کو لیکر بٹیر دیکھنے گئے میرے منہ
سے بےساختہ نکل گیا کہ حضور کو تو بٹیروں کا مدّت سے
شوق ہے ۔ کروڑوں ہی بٹیر دیکھ ڈالے ہوں گے مگر
صف شکن سا بٹیر تو حضور نے بھی نہ دیکھا ہوگا[1]

پھر آگے چل کر اُن بٹیروں کی لڑائی دکھائی ہے ۔ کہ کس طرح لوگ جمع ہو جاتے تھے ۔ اور لڑائی کے زور کے ساتھ کیسا شور لند ہوتا تھا ۔

" الغرض دوسرے دن پالی ہوئی ۔ ہزاروں آدمی جوق
جوق ان موجود ۔ شہر بھر میں دھوم تھی کہ آج
بڑے معرکہ کی جنگ ہے ۔ بھئی قسم ہے رزق کی
دو چیزیں جس نے نہیں دیکھیں اس نے دنیا میں
کچھ دیکھا ہی نہیں ۔ ایک تو یہ پالی ۔ دوسرے
پیروجل کی سوگھی ۔ ادھر ظفر پیکر اس ٹھاٹھ سے

---

[1] ۔ فسانہ آزاد ۔ جلد اول ۔ صفحہ ۱۲۱

آیا کہ زمین ہل گئی اور میرا تو کلیجہ دھلنے
لگا مگر صف شکن نے اس دن آبرو رکھ لی ۔ جب
ہی تو نواب صاحب اس کو بچیون سے زیادہ عزیز
رکھتے ہین ۔ پہلے اس کو دانہ کھلواتے ہین پھر
کہین آپ کھاتے ہین ۔ ایک دن خدا جانے بلّی
دیکھی یا کیا ہوا کہ اپنے آپ پھرکنے لگا ۔ نواب
سمجھے کہ بوندا ہو گیا پھر تو ایسے دھارون
دھار روئے کہ گھر بھر مین کہرام مچ گیا ۔ مین
نے نواب صاحب کو کبھی روتے دیکھا نہین ۔
مجالس عزا مین ایک آنسو نہین نکلتا ۔ جب بڑے
نواب صاحب نے انتقال کیا تو اشک کا ایک قطرہ
بھی نہ گرا ۔ بھئی یہ بشیر ہی ایسا انمول ہے
اور سچ تو یون ہے کہ اس نے اس دن نواب کی
سات پیڑھیون پر احسان کیا واللّٰہ جو کہین
گھٹ جاتا تو بندہ تو جنگل کی راہ لیتا میان
جنگ مین آبرو ہی آبرو تو ہے ۔ اور ہے کیا ۔
خیر صاحب جیسے ہی دونون چکھی کھا چکے ۔
ظفر پیکر بجلی کی طرح صف شکن کی طرف چلا ۔
یہ ثوری وہ گھاگر آتے ہی دبوچ بیٹھا اور چوٹی

کو جونچ سے پکڑ کر ایسی ایسی مڑوڑیان دین کہ
دوسرا ہوتا تو ایک رگڑے مین پھر سے بھاگ کھڑا
ہوتا ۔ نواب کا اس دم چہرہ فق ہو گیا ۔ اور
کلیجہ شق منھ پر ہوائیان چھوٹنے لگین ۔ نصیب
اعدا زہر کھانے کا وقت پہونچا کہ اتنے مین صف
شکن قلفی کر کے لوٹ ہی پڑا ۔ واہ میرے شہر ۔
خوب پھرا ۔ پالی بھر مین آواز گونجنے لگی ۔کہ ا ہو ہو
ہو وہ مارا ہے ۔ ہان بیٹے دے بڑھ کر لات ایسی
ایک لات ایسی جمائی کہ ظفر پیکر نے منھ پھیر
دیا ۔ منھ کا پھیرنا تھا کہ صف شکن نے اچک کر
ایک جھنجھوڑی بتائی کہ واہ واہ وا ۔ اُسی مقام
پر ایک لات اور کس کر ا ہو ہو ہو شاباش ۔ واہ
بیٹھے ۔ ا ہو ہو ہو ۔ ایسی جگہ ایک اور ا ہو ہو ہو
لگا ایک اور مڑوڑی ۔ ا ہو ہو ہو اتنے مین میان ظفر
پیکن فیج کر کے نوکدم پالی باہر ۔ پھر سے اُڑ گیا ۔
پالی بھر نے کہا وہ بھگایا ۔ وہ مارا ۔ جو طرفہ
ٹوپیان اچھل گئین ۔ اور زفیل بجنے لگین واہ رے صف
شکن ۔ ظفر پیکر گھٹ گیا تو صف شکن کا دل اور
بھی بڑھا ۔ آج یہ بٹیر اپنا ثانی نہین رکھتا "[1]

---

[1] ۔ فسانہ آزاد جلد اوّل ۔صفحہ ۔ جھنجھوٹی ۔وار کرنا ۔حملہ کرنا

اس طرح کی لڑائیون مین نواب ایسے مگن ہو جاتے کہ ان کو اپنے مرتبہ کا بھی خیال نہ رہتا تھا ۔ اور دوسرے لوگون کے ساتھ خود بھی خوش ہو ہو کر آوازین لگاتے تھے ۔ ان بٹیرون کے نام بھی رکھے جاتے تھے مثلاً رستم سہراب ۔ صف شکن ۔ ظفر پیکر ۔ شہرہ آفاق وغیرہ وغیرہ ۔ اگر کسی نواب کا بٹیر اُڑ جاتا تو اس کے یہان ماتم اس طرح ہوتا تھا ۔ گویا کوئی اپنا قریبی عزیز بچھڑ گیا ہو ۔ نواب کا عزیز اور جان سے زیادہ پیارا صف شکن کھو جاتا ہے تو یہ خبر سنتے ہی نواب صاحب کی ایسی حالت ہو جاتی ہے جیسے بٹیر نہین ان کا جوان بیٹا اس دنیا سے کوچ کر گیا ہو ۔ اور پھر دربار مین ان بھولے نواب کے ساتھ ان کے مصاحبین بھی اس انداز سے ماتم کرتے ہین کہ پڑھ کر ہنسی آتی ہے ۔

"۔۔۔۔۔ بٹیر کیا اُڑ گئے نواب صاحب کے
ہاتھون کے طوطے اُڑ گئے ۔ آنکھون سے اشک
جاری ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہین ۔ کلیجہ بلیون
اچھل رہا ہے ۔ چہرے پر ہوائیان اُڑی ہوئی
ہین ۔ ہائے صف شکن پیارا صف شکن ۔

اگر دانستم از روز ازل داغ جدائیہا
نمی کردم بدل روشن چراغ اشنا جدائیہا

مجھے تو اس سے عشق ہو گیا تھا جی مین تو اسکی
بانکی ادا پر جان دیتا تھا ۔ یارو وہ نکیلی چونچ وہ بےتابی
سے کاکن کا چگنا چکّھی بھائی اور ڈٹ گیا ۔ سیکڑون
معرکون مین لڑایا مگر کورا آیا ۔ دو دو چونچین ہوئین
اور بٹیر دم دبا کر بھاگا ۔ پھر سامنا ہوا اور منہ
پھیر دیا ۔ کس بانکپن سے جھپٹ کر لات دیتا تھا
کہ پالی بھر تھرّا اوٹھتی تھی ۔ اور اس کی بساط
ہی کیا تھی ۔ منجھولا جانور ۔ لیکن بلا کا کسربل ۔
اور قسم ہے صف شکن ہی کی اس کی خوبیان تو
مجھے آج ہی کھلین ۔ یہ تو مین پہلے ہی جانتا
تھا ۔ کہ وہ حقّانی جانور ہے ۔ صورت بٹیر کی
مگر سیرت قرا کی ۔ اور ایک پنڈت نے مجھ سے
کہا تھا کہ یہ کیا جانے کیسی کھنڈت ہو گئی
نہین تو اس کا بڑا درجہ تھا ۔ اب سنا کہ نماز
بھی پڑھتا تھا ۔
صاحب ۔ حضور کو یاد ہوگا کہ رمضان شریف کے
مہینے مین اس نے دن کے وقت دانہ تک نہ چھوا
حضور سمجھے تھے بوندا ہو گیا مگر مین تاڑ گیا کہ
پابند صوم و صلوٰۃ ہے ۔

خوجی ۔ جلِّ جلالہٗ ۔ جلِّ جلالہٗ ۔ کیا شان کبریائی ہے ۔
خداوند اب مین بھی حضور سے کہتا ہون ۔ کہ دس پانچ دفعہ
مین نے افیم بھی پلا دی ۔ مگر واللّٰہ باللّٰہ ثم باللّٰہ جوذرا
بھی نشہ ہوا ہو ۔ ہان انکھڑیون مین لال لال ڈورے تو
پڑ گئے تھے ۔

میر صاحب ۔ پیرو مرشد، یقین جانیئے پچھلے پہر سے سحر کاذب
سے حق حق کی آواز کابک سے آیا کرتی تھی غفور
تم کو بھی ہم نے کئی بار جگا کر سنایا تھا ۔کہ
صف شکن یاد خدا مین مصروف ہین ۔

غفور ۔ ہان میان پچھلے سے حق حق کیا کرتے تھے ۔
اور اکثر یہ دیکھا تھا کہ سجدہ کر رہے ہین

خوجی ۔ جلِّ جلالہٗ جلِّ جلالہٗ ۔ واہ میان صف شکن
علی شاہ ۔

نواب ۔ بھئی ہم نے اسے پہچانا ہی نہین ۔[1]

خلاصہ یہ ہے کہ صف شکن کے کھو جانے پر کافی بحث و مباحثے ہوئے ہین ۔
اور دربار مین اسی طرح گفتگو ہوتی ہے ۔ کہ جیسے کئی بے وقوف آپس مین
باتین کر رہے ہون ۔ نواب صاحب اس طرح کے شعر آہین بھر بھر کر پڑھ

---

فسانہ ازاد جلد اول ۔ صفحہ ۱۶۷ تا ۱۶۸

رہے ہین ۔ جیسے کوئی فرقت‌زدہ اپنے غم کا درد انگیز بیان کر رہا ہو۔

ان بٹیرون کے لئے خوبصورت اور نازک کابکین بنائی جاتی تھین ۔ یہ زیادہ تر ہاتھی دانت کی ہوتی تھین ۔ نوابون کے یہان ان پر ہزارون روپیہ صرف ہوتا ۔ اگر کوئی بیمار ہو جاتا تو طرح طرح سے اس کا علاج کراتے ۔ جس وقت ان کو لڑاتے تو بٹیر کے منہ پر عطر یا کوئی کڑوی چیز لگا دیتے تھے ۔ تاکہ دوسرا بٹیر چونچ مارتے ہی لڑائی چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہو۔ یا پھر یہ کرتے کہ اپنے بٹیر کو کوئی نشہ اور دوا کھلا دیتے ۔ اس سے وہ بے حس ہو جاتا اور حریف کو جب تک بھگا نہ دیتا برابر لڑتا ہی رہتا ۔ کیونکہ اس پر ایک قسم کا جنون سا طاری ہو جاتا تھا ۔

غازی الدین حیدر کے زمانے مین تو دوہرے اور ایک ٹانگ کے بٹیر لڑائے جاتے تھے ۔ جان عالم کے زمانے مین یہ مشغلے اپنے عروج پر تھے ۔ ہفتہ مین جمعہ کے دن بٹیر لڑائے جاتے تھے ۔ بڑے بڑے بٹیرباز اپنے بٹیرون کو تیار کر کے لاتے ۔ دونون طرف کے شور و غل سے کان پڑی اواز سنائی نہ دیتی تھی ۔

ان کے علاوہ لکھنؤ مین جن چڑیون کو لڑانے اور اڑانے کا شوق تھا ان مین گل دُم ۔ لوے اور طوطے بھی تھے ۔ ان پر بھی ہزارون روپیہ خرچ کیا جاتا تھا ۔ اور ان کی صحت کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا ۔

## پتنگ بازی ۔

جس طرح لکھنؤ کے لوگ پرندون کو لڑاتے تھے ۔اسی طرح پتنگ بازی بھی لکھنؤ مین بڑے زور و شور سے ہوتی تھی ۔ یہان کے لوگون نے تکّل ۔ گڈی ۔ اور پتنگ کی آرائش اور زیبائش پر خاص توجہ کی۔ پتنگ اڑانے کے ساتھ پتنگ لڑانے کا بھی بے حد شوق تھا ۔ بازی سے پیچ لڑائے جاتے اور آوازین لگتی تھین ۔ دو پارٹیان ہوتی تھین ۔ اور دونون طرف بڑے بڑے ڈھول رکھے ہوتے تھے ۔ جس طرف کی بھی پتنگ مخالف پارٹی کی پتنگ کو کاٹ دیتی تو فوراً فلک شگاف شور بلند ہوتا اور اسی کے ساتھ ڈھول بھی بجتے ۔ شور اور ڈھول کی آواز کافی دیر تک گونجتی رہتی تھی ۔ اس کے بعد دوسرا پیچ لڑایا جاتا اور پتنگ کے کٹتے ہی شور بلند ہوتا تھا ۔ پہلے پیچ لڑانے کا طریقہ یہ تھا کہ پتنگ کو ڈھیل دے کر لڑاتے تھے لیکن انگریزون کے آنے کے بعد کھینچ کر پیچ لڑائے جانے لگے ۔ فسانہ آزاد مین پتنگ بازی کا بھی ذکر ہے ۔

آزاد ------ کیا پتنگ بیچنے جاتے ہو ۔

پتنگ باز ۔ لاحول ولا قوت کتنے بے تکے آدمی ہو ۔ ہم خود گھر کے امیر ہین پتنگ بیچین ہمارے دشمن ۔ کوئی اور کہتا تو گردن ناپتا ۔

آزاد ۔ گردن تو پیچھے ناپیئے گا ذری ڈنڈ بل میرے دیکھ لیجئے ۔

پتنگ باز ۔ ارے بھئی یہان سے کوئی چار کوس پر ایک قصبہ ہے ۔

وہان ایک رئیس زادے ہمارے لنگوٹیے یار ہین ہم سے پتنگون کا
میدان بدا گیا تھا' ہم اپنے رفقاء کو لے کر ایک بارہ دری کے
کوٹھے پر تھے' وہ اپنے دیوانخانے کی چھت پر حوالی موالی
لئے ہوئے تھے - کوئی سات بجے سے ادھر بھی پتنگ چھپکے'
ادھر بھی بڑھے خوب لم ڈورے لڑے - پانچ روپیہ فی پیچ بدا
تھا - یار ایک پتنگ خوب لڑا' ہم نے مانگدار بڑھایا تھا اور ادھر
سے گول دو پنا کل پتا جھپکا دیا دس بارہ منٹ داؤ گھات
کے بعد پیچ پڑ گئے پہلے تو ہمارے کنّے نتھ گئے - ہاتھون کے
طوطے اڑ گئے سمجھے کہ اب گئے اور اب گئے مگر واریے استاد
ایسے کنّے چھڑائے' کہ واہ جی واہ' پھر پیچ لڑ گیا خدا جھوٹ
نہ بلائے تو پنسیریون ڈور پلا دی - کنکوّا آسمان سے جا لگا
جو کوئی دم اور ٹھرتا تو جل بھن کے خاک ہو جاتا - کرۂ ناز
تک پہونچنے ہی کو تھا اتنے مین ہم نے غوطہ دیکر ایک
بھبکا جو دیا تو وہ کاٹا وہ کاٹا - فریق ثانی ( ارے ) کر کے
رہ گئے اب کوئی کہتا ہے ہتّے پر سے اکھڑ گیا کوئی کہتا ہے
ڈور الجھ گئی تھی مگر یہ باتین ہین اب سنئے حماقت نے جو
گھیرا تو چلے چمٹانے - کھٹ سے الگ تھا بیوی گئی تھین نماز
بخشوانے روزے گلے پڑے - ایک خربوزیے کنکوئے سے ہم نے نو
دس کے قریب کاٹے - مگر پھر تو کچھ ایسی ہوا چلی کہ توبہ

ہی بھلی ۔ ان کی طرف کوئی بلا کا اُستاد آ گیا اس نے تو
حضرت کھینچ کے وہ وہ ہاتھ دکھائے کہ الامان۔ہاتھ ہی
ٹوٹین مروک نے چھکّے چھڑا دیئے کبھی سٹر سٹر کرتا ہوا
نیچے سے کھینچ گیا کبھی اوپر سے پتنگ پر جھاپ بیٹھا
کبھی دھوکا دے کر دھرا نکال لے گیا ۔ آخر مین نے
حساب جو لگایا تو پچاس کے پیٹے مین گئے اور یہان ٹکا
پاس نہین ہم نے بھی ایک مال تک لیا ہے گھر کے سونے
کے کڑے کسی کے ہاتھ پٹیلین گے کوئی دس تولے کا ہوگا
چپکے سے اڑا دون گا کسی کو کانون کان خبر ہو تو ہاتھ
کٹوا ڈالون آئی گئی نوکرون ماماؤن اصیلون کے ماتھے
جائے گی ۔۔۔[1]

گھر کی کوئی چیز پتنگ کے لئے بیچ دینا کوئی بڑی بات نہ تھی بس شوق پورا ہو جانا چاہیئے تھا ۔ اور اس شوق کا عالم تو یہ تھا کہ خود آصف الدولہ کی پتنگ مین پانچ روپے کی مقیش کی جھلجھلی ہوتی تھی ( اس وقت پانچ روپے بڑی رقم ہوتی تھی ) جو بھی اس کو لوٹ کر لاتا تھا اس کو پانچ روپے دے کر وہ پتنگ واپس لے لی جاتی تھی ۔ آصف الدولہ خود بھی پتنگ اُڑاتے اور لڑاتے بھی تھے ۔

---

[1] ۔ فسانہ آزاد ۔ جلد اول ۔ صـ ۲۲۷ تا ۲۲۸

پتنگ بازی کے پرانے اُستاد[1] میر عمدہ ۔ خواجہ مٹھن شیخ امداد تھے ایک جولاھے نے بھی ان دنون پتنگ بازی کے فن مین کمال حاصل کیا جس کی وجہ سے اُمراء کی محفلون مین اس کی بڑی قدر ہونے لگی تھی ۔ مردون کے علاوہ عورتون کو بھی پتنگ اڑانے کا شوق تھا اور وہ بھی اپنے کوٹھون پر کھڑی ہو کر پتنگ اڑاتی اور پیچ لڑاتی تھین ۔ فسانہ آزاد کے اس اقتباس کو پڑھ کر ان عورتون کے شوق کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔

" ایک دن مین کوٹھے پر پتنگ اڑا رہی تھی بال
کھلے ہوئے زیور سے گوندنی کی طرح لدی ہوئی
مہری کے ہاتھ مین اچکا ٹکچا ماہی جال کا لل
پتا کنکوا بڑھایا تھا ۔ اب مجھے کیا معلوم کہ کوئی
مونڈی کاٹا دور سے تاک جھانک کر رہا ہے ۔ مین
نے ڈھٹھ اتار کر پلنگ پر رکھ دیا اور پیچ لڑانے
لگی ۔ اے ادھر ہم پیچ لڑاتے تھے ادھر وہ
صاحبزادے آنکھین لڑاتے تھے ۔ مین نے کنکوے کے
کنّے ہاتھ لئے اور کاٹنے ہی کو تھی کہ مہری نے
آہستہ سے کہا ( حضور ذری ادھر تو دیکھین )

---

[1] ۔ گزشتہ لکھنؤ ۔ ص ۱۰۱

دیکھتی ہوں کہ اٹھارہ انیس برس کا ایک خوبصورت
لڑکا سر ننگا کوٹھے پر کھڑا نظر آیا ۔ بس کنکوا ونکوا
چھوڑ کے بھاگی اور جھٹ کے کمرے میں چلی گئی "[1]

بیگمات کے ساتھ ساتھ ان کی منشیانیاں ۔ مہریاں بھی پتنگ بازی کرتی تھیں ۔

---

[1] ۔ فسانہ آزاد ۔ جلد سوم ۔ ص ۸۷۷ ۔ ۸۷۸

ان کھیل تماشون کے ساتھ ساتھ لوگون کو تیرنے کا بھی بڑا شوق تھا ۔ لکھنئو مین تیراکی کا میلہ ہوتا تھا ۔ جس کو دیکھنے کے لئے گومتی کے کنارے ہزارون لاکھون کی تعداد مین عوام اور خواص جمع ہوجاتے تھے۔ خود نوابین اس سے خاص طور پر لطف اندوز ہوتے تھے ۔ تیراکی کے میلہ کے علاوہ اور دوسرے میلے جیسے قیصر باغ کا میلہ ۔ گڑیون کا میلہ ۔ آٹھون کا میلہ وغیرہ منائے جاتے تھے ۔ ان میلون کا ذکر اگے تفصیل سے آئے گا ۔

میلون کے علاوہ شکار کا شوق بھی نوابین اور اُمراء رکھتے تھے۔ شیر ۔ چیتا ۔ تندوے ۔ ہاتھی ۔ اونٹ ۔ بارہ سنگھا اور مینڈھے وغیرہ کا شکار ہوا کرتا تھا ۔ نوابین کے ساتھ ان کے مصاحبین بھی ہوتے تھے ۔ شکار کھیلتے اور جتنے دن کا بھی پڑاؤ ہوتا اتنے دنون نوابین کا دل بہلانا ان کا محبوب فرض ہوتا تھا ۔ ہر ایک اس کوشش مین رہتا تھا کہ میری کوئی بات نواب کو پسند آ جائے جس سے بن مانگے انعامات حاصل ہون ۔

ان تفریحی مشاغل کے علاوہ دوسرے کھیل تھے جن کو گھرون مین بیٹھ کر کھیلا جاتا تھا ۔ عورتین بھی ان کو کھیلتی تھین ۔ مثلاً تاش ۔ یہ لوگون کا دلچسپ مشغلہ تھا گھنٹون تاش کی بازیان ہوا کرتی تھین اور ہار جیت چلتی تھی ۔ محلون مین بیگمات تک اس کھیل کو کھیلتی تھین ۔ اور چونکہ یہ کوئی مہنگا کھیل نہ تھا اس لئے اُمراء کی طرح عام لوگ بھی اس کو ذوق و شوق سے کھیلتے تھے ۔

چوسر اور شطرنج کے کھیل بھی عام تھے ان کھیلون کو بھی مرد عورت دونون ہی کھیلتے تھے اور خاص طور پر شطرنج تو بہت ہی عام تھی ۔ اس کھیل مین لوگ اتنے مشغول ہو جاتے تھے کہ ان کو کھیل شروع کرنے کے بعد کسی چیز کا بھی ہوش نہین رہتا تھا ۔ جگہ جگہ دن اور رات اس کا شغل رہتا ۔ اس کا ذکر فسانہ آزاد مین بھی جابجا ملتا ہے ۔

"۔۔۔۔۔سرکار تو چھوٹے میان کے ہان چلے گئے
شطرنج بچھی ہے اور سب کے سب جمع ہین ۔
محلّہ بھر ۔ بیگم صاحب نے تنک کر کہا جا کے ابھی
ابھی بلا لاؤ ۔ کہو اس شطرنج کو آگ لگے جب
دیکھو شطرنج ہی کا شغل رہتا ہے ۔ کھانا پینا
اس کی بدولت چھوٹ گیا ۔ موئی بُری لت ہے کہ توبہ
توبہ جاکے کہو ابھی ابھی بلایا ہے ۔ سب کے
سامنے کہنا کہ بیگم صاحب خفا ہو رہی ہین کہتی
ہین کہ خط تو پڑھ جاؤ۔۔۔۔۔اسکے کیا معنی دن
رات شطرنج ۔ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے
شطرنج ہی شطرنج خواب مین بھی شطرنج ہی
سوجھتی ہو گی ۔ جاؤ تو بچہ دیکھو کیسی بےبھاؤ
کی پڑتی ہین کہ عمر بھر یاد کرو" [1]

---

[1] ۔ فسانہ ازاد ۔ جلد سوم ۔ ص ۱۰۸

عورتین بھی شطرنج کھیلتی تھین ۔

" دواجی شطرنج لائین فالسائی اطلس کی بساط ۔
ایک انگشتی لچکا اور لیس ٹکی ہوئی ۔ پاون خانے
بنے ہوئے ۔ چاندی سونے کے مہرے مگر چھوٹے
چھوٹے اور ہلکے ہلکے ۔ پچیس تیس کم سنین بساط
کے اِرد گرد بیٹھین سب حسین مہ جبین ۔۔۔۔۔
تین چالون مین مات ہے اور بادشاہ کو کتنے گھر
چلنے کو ہین فقط ایک گھر الف ۔ اچھا اور کوئی
خانہ نہین ہے ۔ اور نقشے مین پہلے ہاتھ
بادشاہ کو کشت نہین دیتے " [1]

خلاصہ یہ کہ شطرنج جوسر گھر گھر مین کھیلا جاتا تھا اور کھیل کے وقت بڑے زور وشور سے بحث مباحثہ ہوا کرتے تھے ۔ گھرون کے علاوہ نوابون کے دربار مین بھی یہی ہنگامے رہتے تھے ۔ صبح سے لوگون کی آمد شروع ہو جاتی تھی۔ پھر کھیل کے درمیان اگر جیت ان لوگون کی ہوتی تب بھی وہ خود اپنی ہار اور نواب یا بادشاہ کی جیت تسلیم کر لیتے تھے ۔اور اسی مین خوش رہتے تھے۔ کیونکہ ان کا مقصد تو کھیل کم اور نواب کی روٹیان توڑنا زیادہ ہوتا تھا ۔

---

[1] ۔ فسانہ آزاد ۔ جلد سوم ۔ صـــ ۸۷۸ ـــہ

سارا سارا دن کھاتے پیتے مزے اڑاتے ۔ اور ان چیزون کے لئے یہ ضروری تھا کہ نواب کو خوش رکھا جائے ادھر شطرنج کی بساط بچھی ادھر نواب کی سچی جھوٹی تعریفین ہوتین ۔ افیم گھولی جا رہی ہے ۔ ایک سے ایک ماہر افیم موجود ہین نشہ چڑھ رہا ہے ۔ اول فول بک رہے ہین ۔ رئیس خوش ہو رہے ہین اور افیم کے نشہ مین بیٹھے ہین ۔ فسانہ آزاد مین اسی طرح کی ایک محفل جمی ہے ۔

رئیس ۔ یہ افیم بھی تو اپ نے ہی گھولی تھی ۔
واللہ مزہ آ گیا ۔
بندہ ۔ قربان جاؤن حضور ایسی افیم پلاؤن کہ قیامت
تک پینک رہے دخل کیا کہ بے کیف ہو جائے
ہاتھ تلے ہوتے ہین ۔ سانچے کے ڈھلے
ہوتے ہین ۔ پیر و مرشد کمال یہ ہے کہ دیکھتے
دیکھتے آنکھین سرخا سرخ ہو جائین لال
لال ڈورے رنگ جمائین بلبل کے زیر بال کا
لطف حاصل ہو ۔ کیا مجال کسی دوسرے کے
ہاتھ کی افیم بھائے ۔ اب شام کو حکم ہو تو
غلام پھر پلائے ۔" [1]

---

[1] ۔ فسانہ آزاد ۔ جلد اوّل ۔ ص ۱۵۵

دربار کے دوسرے لوگ اگر دیکھتے کہ کسی ایک کا رنگ رئیس پر چڑھ رہا ہے۔ تو ان کو فکر ہو جاتی کہ کہیں ہم اب نواب کی نظر سے گر نہ جائیں اور پھر وہ اپنے کو بڑھانے کی فکر میں طرح طرح سے اس شخص کی غیبتیں کرتے۔ محفل آرائی لکھنؤ کی تہذیب کا جزو اعظم تھا اس کے لئے بڑا اہتمام کیا جاتا تھا ۔ گرمیوں کی شامیں بڑے لطف کے ساتھ گزرتی تھیں ۔ ہر گھر میں پانی سے چھڑکاؤ ہوتا چاندنیاں لگ جاتیں کورے گھڑے پانی سے بھرے ہوتے ۔ اور ان کے اوپر پھول پڑے ہوتے ۔ بڑے بڑے تخت صحن میں بچھ جاتے اور اس پاس کے لوگ جمع ہونا شروع ہو جاتے ۔ کبھی شعر و شاعری ہو رہی ہے ۔ کبھی رقص و سرور کی محفل جمی ہے ۔ غرض ہر روز عجب بہار رہتی تھی ۔ مثلاً ایک رئیس کا مکان ہے اور شام کا وقت ہے ۔ سرشار اس کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں ۔

" وسط باغ میں سنگ مرمر کا صاف شفاف چبوترہ ہے اور اس پر فرش مکلف بچھا ہے اور ایک رئیس با توقیر صدر محفل قلعہ نظیر مع رفقائے فرمان پذیر و تحویر بیٹھے ہیں ۔ شعر خوانی ہو رہی ہے ۔ اپنا اپنا رسوخ پیدا کرنے کے لئے ہر ایک صاحب اساتذہ بے ہمتا اور شعرائے غزا کے چیدہ چیدہ اشعار پڑھ رہا ہے ۔

وحشت عیان ہے خاک سے مجھ خاکسار کی
بھڑ کے ہرن بھی سونگھ کے مٹی مزار کی

دوسرے صاحب بولے بھئی یہ رنگ پسند نہین ۔ پھیکا رنگ ہے ۔

دوسرا شعر ہم سنائین ۔

آبداری تو کرین خنجر مژگان پیدا ۔

ہم بھی کرینگے ہر اک سوسے رگ جان پیدا

دو چار حاظرین جلسہ نے گردن ہلائی ۔ مگر ایک صاحب جل مرے، کہ ایسا نہ ہو رئیس گردون مدار کے کے مزاج مین دخیل ہو جائین، تو ہم پھسڈی ہی رہین اِنھون نے یہ شعر پڑھا ۔

من عاشقم دیار بکاردِ گرانست
چون غرۂ شوال کہ عیدِ رمضانست

اکثر مصاحبین نے اس پر وجد کیا ۔ سبحان اللّٰہ ع چون غرہ شوال کہ عید رمضان ست، کتنا خوب کہا ہے ۔ اتنے مین رئیس والا تبار نے فرمایا کہ جام و مینا کی تعریف مین کچھ شعر سنائیے -----

رئیس با وقار نے اس غزل کی بڑی تعریف کی اور فرمایا کہ بھئی ہمین تو آتش اور حافظ کا رنگ دل سے پسند ہے -----

نہایت جوش پر دریا ہے اپنے طبع موزون کا
جہان مین شور ہے طوفان آب و دُرِّ مضمون کا

ایک صاحب نے کہا خداوند نعمت فصاحت اور جادو طرازی مین، انیسؔ، میر، بول چال مین، آتش مغفور، خیالات مین ناسخ، تشبیہہ مین ذوق ۔ عاشقانہ رنگ مین مومن ۔

بلاغت مین دبیر، استعارے مین میان امانت ۔ مثنوی مین نسیم لکھنوی، واسوخت مین عیشی ۔ ریختی مین بیدل ۔ محلات کی بول چال مین حکیم نواب ۔ خدا جانتا ہے کہ قلم توڑ گئے اور سرور ، تو خدائے نثر تھے ۔۔۔۔۔" [1]

ان نوابون اور رئیسون کے شوق اور محفلون کی سرگرمیون ہی کی وجہ سے اردو شاعری لکھنئو مین بہت ترقی کر گئی ۔ اور مشاعرہ لکھنئو کی زندگی کا جزو بن گیا ۔ آتش ۔ ناسخ ۔ انیس ۔ دبیر وغیرہ کی پارٹیون مین برابر کی چوٹین ہوا کرتی تھین ۔ محفلین جمتی تھین ۔ آپس مین مقابلہ ہوتا تھا ۔ اور لوگ خوشی خوشی ان محفلون مین شرکت کرتے تھے ۔ سرشار ایک مشاعرہ دکھاتے ہین ۔

" اب شعر خوانی ہونے لگی ۔ ایک شعر پڑھتا ہے ۔ باقی داد دیتے ہین اے سبحان اللّٰہ، واہ میر صاحب ۔ یہ حضور ہی کا حصّہ تھا ۔ حاصل زمین، بارک اللّٰہ، کیا خدا داد طبیعت پائی ہے ۔ واللّٰہ کیا ذہین کی رسائی ہے ۔ پھر فرمائیے گا، حضرت خدا کی قسم قلم توڑ دیئے ۔ کیا روزمرّہ ہے، اس بول چال کے صدقے واللّٰہ، کیا خوب تقسیم ہے ۔ ٹھیان اچھل رہی ہین

---

[1] ۔ فسانہ آزاد ۔ جلد اول ۔ صـ۱۲۱ تا ۱۲۳ـ

کوئی جھومتا ہے کوئی وجد کرتا ہے " [1]

یہ تو گھروں اور محلوں کے مشاغل اور دلچسپیاں تھیں ۔ اسی کے ساتھ اگر ایک نظر لکھنؤ کے بازار پر بھی ڈالتے چلیں تو اس وقت کے لکھنؤ اور وہاں کی معاشرت کی تصویر پورے طور پر ہمارے سامنے آجائے گی ۔ پیسے کی زیادتی اور مزاجوں کی رنگینی نے لوگوں کو مست اور لاابالی بنا دیا تھا ۔ ایک سے ایک عمدہ چیز بھی یہاں موجود تھی ۔ پھر وہ ہر طرح کی فکروں سے دور تھے ۔ بازار کی ایک جھلک بھی دیکھتے چلیں ۔

"۔۔۔۔کہ دفعتاً ایک مقام پر پہونچے۔ مینو سواد
ہر کوچۂ و برزن آباد ۔ چپہ چپہ رشکِ بہشت
شداد ۔ ذکور چست و چالاک، اناث مست و فرحناک،
مکانات فرح بخش و نغز آراستہ ۔ دکانیں بصد
قرینہ پیراستہ ۔ دلہر میوہ فروش ۔ سبز تہِ گلگون
کی پیاری صدا، تیکھی جتون بانکی ادا ۔ جس
گل زمین میں اس کی دکان ہے، وہ روکش باغ نعیم
ورشک جنان ہے ۔ ثریا دور سے خوشہ انگور کو
تاکے ۔ امرود حلوائے بید دو ۔ سیب دافع آسیب
بہی قوت دل ۔ انار راحِ روح ۔ تنبولی کی دوکان

---

[1] ۔ فسانہ آزاد ۔ جلد اول ۔ صـ۵۸۵ـ

پر شوقین آدمی مصروف جان سپاری ہین اور ایک
عالم مشغول خریداری اور کیون نہو سرخروئی کا
کا بیڑہ اٹھایا ہے ۔ سبز بخت کا خطاب پایا ہے
ادھر ٹکا ہاتھ مین لیا ادھر چاندی کا ورق لگا
کر بیڑہ دیا۔کتھا کیوڑے کا بسا ہوا ایک گلوری
کھائیے تو غذائے ثقیل ہضم ہو جائے ۔ مگھے کا
منہ کالا ۔ مہو باگرد کر ڈالا ۔ تمباکو والے کی
دلکش دکان پر اور ہی آن بان ہے ۔ نوالی سج
دھج انوکھی شان ہے، جسے دیکھو اس کا دم
بھرتا ہے ۔ ناکے پر پہنچے تو مہتاب دروازے تک
تڑاقے کی آواز جائے ۔ نیچہ کیا ہزار داستان ہے ۔۔
گندھی کی دکان عنبر بار کی طرف سے جو گذر ہوا ۔
تو دماغ طبلۂ عطار بن گیا ۔ خوشبو کیا فتنۂ روزگار
ہے ۔ کسی کنٹر مین عرق عروس، کسی مین عرق بہار
خراج خطا و ختن اس کا مول ہے ۔ قنوج اور
جونپور اس کی جاہ مین ڈانوان ڈول ہے ۔ لخلخہ
و رائحہ سے دماغ معنبر ہے، دور تک شمیم عنبر بیز
عطر روح پرور ہے ۔ دلدار جوڑی فروش بلائے بیدر
مان ہے ۔ جوڑی سیاہ رو کش سرمہ آلودہ چشم

خوبان ہے ۔ سبز چوڑی سبزان ہند کی یاد دلائے،
سرخ چوڑی کے رشک سے یاقوت احمر ہیرا کھائے
صورت دیکھے جی للچائے۔زاہد صد سالہ بھی
دیکھ پائے تو بے دام چکائے خرید لے جائے۔
رعب حسن سے مول تول کا لفظ زبان پر نہ لائے۔
چوڑی کیا مشاّط چابک دست ہے ۔ جو ساعد
سیمین کے جوبن کو بھڑکائے بانک دیرینہ روز کو
محبوب چاردہ سالہ بنا دے ۔ پھر جوہری کے
دکانچہ زرنگار پر جو نظر پڑی تو گویا پکھراج
پری سے آنکھ لڑی فلک دیکھے تو (راتی) آبدار پر
انجم نثار کرے ۔ ---- پھر بزازے کی طرف جو
نکل گئے تو اب روان کی جھلک پر خریداری کا
شوق جرایا۔روپیہ گاڑھے وقت کام آیا ۔ زربفت
گلبدنوں کو بھایا ۔ لالہ نین سکھ سے بھاؤ
چکایا ۔ انھوں نے کبھی دس کبھی پانچ دام
بتائے دھوپ چھانھ سے گرگٹ کے ایسے رنگ
بدل کر شرمایا ۔ حلوائی کا میٹھا پکوان غضب
کا آب و تاب ۔ ہم خرماؤ ہم ثواب ۔ برفی دیکھیئے
تو منھ میں پانی بھر آئے چشم کا حی چاہے کہ

تھال کے تھال کھا جائیے ۔ کتب فروش کی دکان پر شائقین
علم و ہنر کی گرم بازاری، شمع کتب پر اہل قلم کا
پروانہ وار ہجوم ہے۔ شعرا کے تذکرے ۔ واہین
ندرت طراز مثنوی، کتب اخلاق ۔ طب کے نسخے
تاریخ، علم ہیئت اور طبیعات کے رسالے ۔۔۔۔۔
بازار نشاط کی گرم بازاری، نے غم دزدنے غم
کالا، عیش و عشرت کا بول بالا ۔۔۔۔۔۔باشندے
سب مرفہ حال، سیم و زر سے مالا مال، بشرے
سے خوشی ٹپکتی ہے ۔ چہرے سے مسرت برستی
ہے "۔ [1]

اس اقتباس کو پڑھ کر ہمین بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہان کے لوگ کتنے خوش حال اور اپنی زندگی سے کسی قدر مطمئین نظر آتے تھے ۔

---

[1] ۔ فسانہ آزاد ۔ جلد اوّل ۔ ص ۱۲۲ تا ۱۲۳

فن موسیقی -

لکھنئو کے لوگون کو موسیقی سے بھی بے حد لگاؤ تھا - خود شجاع الدّولہ کو اس فن سے گہری دلچسپی تھی - اور ان کی فیاضی کی بدولت سارے ہندوستان کے موسیقار اودھ مین آکر جمع ہو گئے تھے اجودھیا اور بنارس کے موسیقی کے اسکول تو پہلے ہی سے موجود تھے اس کے علاوہ جونپور مین بھی ابھی کچھ کچھ لوگ اگلے وقتون کی یادگار موجود تھے - دھلی کے موسیقار بھی رفتہ رفتہ یہان آ پہونچے اور اب گویا موسیقی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا - شجاع الدولہ کے شوق کی بدولت ان کے دربار مین بے شمار طوائفین دور دور سے اکر جمع ہو گئین تھین - جس وقت بادشاہ وزیر یا امراء جنگ کو جاتے تو اپنے ساتھ ان گانے بجانے والون کے ڈیرے بھی لے جاتے تھے - درباروں مین تو موسیقی کی محفلین ہر روز ہوتی تھین البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جہان اس فن کو عام طور سے تفریح کے لئے استعمال کیا گیا وہین اس کی ترقی کی طرف بھی دھیان دیا گیا - آصف الدولہ کے عہد مین فارسی کی ایک کتاب " اصول النغمات الاصفیہ " تصنیف ہوئی - غالبا ہندوستان مین اس کتاب کے مقابلے کی کوئی دوسری کتاب نہین ہے -

واجد علی شاہ کے زمانہ مین موسیقی کا جیسا عروج لکھنئو مین ہوا اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا - کیونکہ واجد علی شاہ خود اس فن کے ماہر تھے اور موسیقی سے بے پناہ لگاؤ رکھتے تھے -

ان کے دربار مین فن کارون کو خطابات اور انعامات ملتے تھے ۔ خود واجد علی شاہ نے بھی کئی راگنیان ایجاد کی تھین ۔ اور ان کے نام خود ہی رکھے تھے ۔ جوگی ۔ کنٹر ۔ جوھی وغیرہ ۔ بہت سے باکمال اہلِ فن کو انھون نے یکجا کر دیا ۔ تان سین کے خاندان کے باکمالون مین پیارے لال ۔ جعفر خان حیدر خان ۔ محمّد علی خان اپنے فن مین لا جواب تھے ۔ ان کے علاوہ بھی اور دوسرے فن کار دربار مین موجود رہتے تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ واجد علی شاہ کا دربار راجہ اندر کا اکھاڑا ہو گیا تھا ۔ دربار کے اثر سے عوام کو بھی اس فن سے بے حد دلچسپی پیدا ہوگئی تھی ۔ گلی کوچون مین پھیری والے ایسے ایسے سرون مین آوازین لگاتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا انھون نے کلاسیکی راگ اور راگنیون کو گلے مین اتار لیا ہے ۔ گھر گھر جہان بھی کوئی تقریب ہوتی مثلاً شادی بیاہ ۔ جھٹی بسم اللّٰہ ۔ ختنہ ۔ دودھ بڑھائی ۔ ان سب مین طوائفین ضرور ناچتی گاتی تھین بغیر ان کے محفل سونی معلوم ہوتی تھی ۔ فسانہ آزاد مین ایسی محفلون کا ذکر کئی جگہ ملتا ہے ۔ مثلاً

" فراخ اور وسیع میدان مین ایک دیوان سپہر
تو امان ہے جو طرفہ سبزہ نور میدہ کی لہک
اور گلہائے مشک بیز کی مہک بقول عنایت اللّٰہ

خود آگاہ ۔ نمک ریزی، سمزان بہادر، اشگری مرغان
چمن زاد و مستانہ روی آب رود بار قہقہہ تدردان
خوش رفتار، وپاے کوئی غزالان مینا سم و فیناگری
طاؤسانی موصع دُم ۔ غرضکہ عجب بہار ہے ۔ سرد
دربار چمن کا جیدار ہے ۔ بستی سے باہر گولی
بھر کے پٹے پر باغ ہے ۔ جس کے چہار سمت
جنگل اور باغ ہے ایوان عالیشان کے بیچون بیچ
ایک سجے سجائے کمرے مین بزم طرب اراستہ اور
محفل سرور پیراستہ ہے ۔ چاندنی وہ صاف
بچھی ہے کہ چاندنی بھی شرمائے اور ادھر
مے کی گلابیان چنی ہوئی ہین ۔ صراحی گردن
کشی کر رہی ہے لعل آتشین خوان جوہر روح
کے جام منتظر ہین کہ لب سے لب ملے "[1]

دوسری جگہ ذکر کرتے ہین ۔

" یاران سرپل بیٹھے رنگ رلیان مناتے ہین ۔
مغلانی خان پری چہرہ شادیانے بجاتے ہین ۔

---

[1] ۔ فسانہ آزاد ۔ جلد اوّل ۔ ص۲۷۰ و ص۲۹۰

مراثنین ۔ صرف گانے بجانے والی عورتین ۔ جو شادی بیاہ کی رسمون کے وقت بھی کچھ کام انجام دیتی ہین ۔

طبلے پر تھاپ ہے ۔ گت بج رہی ہے ۔ حاظرین
جلسہ زیر و بم سے واقف چڑھاؤ اتار کے سمجھنے
والے خوش رو خوش گلو ۔ کوئی تان سین بنا بیٹھا
ہے کوئی بیجوبارہ گردن سب کی ہل رہی ہے ۔
۔۔۔۔۔ایک بت پندار شوخ و ستم گار نے یہ
غزل لطف و انداز برنائی اور شان خود آرائی سے
ادا کی ۔

خدا جانے یہ آرایش کریگی قتل کس کس کو
طلب ہوتا ہے شانہ ائینہ کو یاد کرتے ہین

اس پر کٹاؤ تھے ۔ سب بیخود ۔بیہوش بیقابو ۔ بیدل
بے صبر ۔ سرپا کی خبر نہین ایک رند عالم سوز و
ازادہ نغمہ سنجی کے دلدادہ نے چوتانے کی فرمائش
کی ۔ کہنے بھر کی دیر تھی سارنگی غضب ڈھانے
لگی اور ( مجھر یا بند یا لیگیو مور ) کی آواز
خوش آنے لگی "۔

گاؤن اور قصبات مین بھی گانے بجانے کے بغیر کوئی محفل نہین ہوتی تھی گھرون کے اندر مراثنین گانا بجانا کیا کرتی تھین ۔ ڈھولک بجا بجا کر گیت گائے جاتے تھے ۔ مہمان عورتین اور گھر کی عورتین خوش ہو کر روپیہ پیسے دیتی تھین ۔ اگالدان قریب رکھے ہوتے خاصدان موجود پانون کا دور چلتا

رهتا اور ناچ گانا هوتا رهتا ۔ مراثنین روپیه پیسه هاتھ مین لے کر دعا دیتی تھین که الٰہی بیٹا هو ۔ سہاگ بنا رهے ۔ وغیره ۔ اگر شادی بیاه کی محفل هوتی یا چھٹی هوتی تو اس مناسبت سے کبھی زچه کے یا دولھا و دلھن کے رشته دارون کو آواز دے دے کر نیگ مانگے جاتے ۔ اور جو بھی تقریب هوتی اس کی مناسبت سے گیت گائے جاتے ۔

موسیقی اور محرم ۔

آخر آخر موسیقی کا رواج اتنا بڑھ گیا کہ یہ عزاداری کی مجلسون مین بھی دخل پا گئی ۔ لکھنئو مین عزا داری کی محفلین گھر گھر ہوتی تھین ۔ ان مین واقعاتِ کربلا کو نوحون اور مرثیون کے ذریعہ گا گا کر تازہ کیا جانے لگا ۔ ان مین اکثر تین آدمی ہوا کرتے تھے ۔ جس مین دو سر ملاتے اور تیسرا بیچ مین بیٹھ کر سوز سناتا تھا ۔

یہان مجلسون کے اہتمام کا مختصر ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ امراء کا یہ طریقہ تھا کہ وہ مجلس کے لئے دعوتی کارڈ تقسیم کراتے تھے ۔ جب لوگ جمع ہو جاتے تو پہلے کوئی منتخب ذاکر تخت پر بیٹھ کر فاتحہ پڑھتا پھر حادثہ کربلا کے متعلق کسی حدیث یا واقعہ کا بیان کرتا ۔ محرم کی نوین تاریخ کو خاص طور پر اِمام باڑون مین مجلسین ہوتی تھین ۔ ان مجلسون مین دور دور سے لوگ آتے تھے ۔

اس مہینے مین ہر سال لاکھون روپیہ روشنی اور دیگر لوازمات پر صرف ہوتا تھا ۔

محرم[1] لکھنؤ میں بڑی اہمیت رکھتا تھا ۔ اس لئے لوگ اس کی بڑی زور و شور سے تیاری کرتے تھے ۔ محرم کے آتے ہی کالے کپڑے پہن لیے جاتے ۔ ان کپڑوں کو ہر ایک بہت پہلے سے تیار کر کے رکھتا تھا ۔ اگر کسی کی اتنی استعداد نہیں ہوتی تھی کہ نیا جوڑا تیار کروائے تو وہ پرانے ہی کپڑوں کو رنگوا لیا کرتا تھا ۔ عورتیں اس زمانے میں اپنے زیور اتار دیتی تھیں۔ یہاں تک کہ چوڑیاں جو ہر عورت کے سہاگ کی نشانی ہوتی ہیں ۔ ان کو بھی اتار دیتی تھیں ۔ ان دنوں کے لئے خاص طور پر دوسرے قسم کے زیور تیار کئے جاتے تھے ۔ یہ زیور بڑے نازک اور حسین ہوتے تھے ۔ کالے کرن پھول کانوں کے لئے ۔ کالے ہار گلے کے لئے ۔ ہاتھوں کے لئے کالی پٹیاں بنائی جاتی تھیں جن کو کلائیوں پر باندھ لیا جاتا تھا ۔

محلوں اور حویلیوں میں سے مرثیہ پڑھنے اور رونے کی آواز روز آتی تھی

---

[1] ۔ گزشتہ لکھنؤ ۔ صفحہ ۱۰۸

اس زمانے کے نوابون اور جاگیر دارون نے امام باڑے بھی بنوائے اور اس شان کے بنوائے کہ وہ آج بھی ان کی یاد تازہ کرتے ہین ۔ سرشار نے فسانہ آزاد مین ان لوگون کا بھی ذکر کیا ہے ۔

" یہ لیجئے آغا باقر کے امام باڑے مین گھٹ سے داخل ا ہو ہو ہو ۔ خدا کی قدرت نظر آتی ہے واہ میان باقر کیون نہ ہو ۔ نام کر گئے چکا چوند کا عالم ہے ۔ لیکن گلی تنگ تماشائیون کی عقل دنگ ہے ع جائے تنگست و مرد مان بسیار ۔ مگر خلقت گھس پیٹھکر دیکھ ہی آتی ہے ۔ ناک ٹوٹے یا سر پھوٹے آغا باقر کا امام باڑا ضرور دیکھین گے۔ وہان سے جو طرارہ بھرا کہ کچے پل پہنچے ۔ دیکھتے کیا ہین کہ ایک پیر فرتوت دقیانوس کے ہمعصر بیٹھے اگلے وقتون کے لوگون کو رو رہے ہین واللہ لکھنئو کے کمہار بڑے نادرہ کار ہین ۔ ایسا بڈھا بنایا کہ معلوم ہوتا ہے ۔ پہلے منہ سے اب بولا اور اب

بولا وہی سن کے سے بال وہی سفید بھوین، وہی
چتون، وہی پیشانی کی شکن، وہی ہاتھون کی جھریان
وہی کمر خم، وہی سینہ جھکا ہوا، واہ رے کاریگر
تو بھی اپنے فن مین یکتا ہے ۔ [illegible] ۔
۔ وہان سے چلے تو داروغہ
میر واجد علی شاہ صاحب مرحوم کے اِمام باڑے مین
آئے۔ یہان سورج مکھی پر وہ جوبن تھا کہ آفتاب
اگر ایک نظر چھپ چھپا کر وہ نور دیکھ پاتا تو
مارے غیرت کے بحر ظلمات مین غوطے [illegible] کھاتا۔ بے تکلف
کرسیون پر جا ڈٹے ۔ اہلکاران سلیقہ شعار نے
چکنی ڈلی، الائچی پیش کی۔ وہان سے حسین آباد
مبارک مین پہونچے سبحان اللہ سبحان اللہ۔ یہ
اِمام باڑہ ہے یا روضہ رضوان الٰہی یہ مکان ہے
یا باغ جنان۔ ہر در دیوار سے محمّد علی شاہ
فردوس آرام گاہ کا نام روشن ہے ۔ اِمام باڑہ سجا
سجایا دولھن کا ایسا جوبن ہے ۔ برجون پر
ضیائے مونوڑ، تو منار نوڑ علیٰ نوڑ حیرت تھی کہ یہ
کوہِ نور ہے ۔ یا شعلۂ طور ہے "۔ ؎

---

؎ ۔ فسانہ آزاد ۔ جلد اول ۔ صفحہ ۔

اس اقتباس کو پڑھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ کہ اُمراء اور نوابین کو اِمام حسینؑ امام حسن اور ان کے رشتہ دارون سے کتنی عقیدت تھی ۔

عام لوگ بھی اپنی حیثیت کے مطابق مجلسین کرتے تھے۔

یہ مجلسین زنانے مردانے دونون مین ہوتی تھین ۔ جن لوگون کو لیے سر کی پہچان نہین تھی وہ بھی اچھے برے سر نکال ہی لیتے تھے ۔ ہندو۔ سنی ۔ شعیہ ہر کوئی تعزیہ رکھتا تھا ۔ اب تعزیہ رکھنے کی وجہ یا تو ان لوگون کا عقیدہ تھی یا پھر بادشاہ کو خوش کرنے کے واسطے ایسا کیا جاتا تھا ۔ ماتم بھی بڑے جوش و خروش سے کیا جاتا تھا بعض لوگ اپنے سینون کو لہو لہان کر لیتے تھے ۔ یہ لوگ تو چھری ۔ چاقو اور زنجیرون سے ماتم کرتے تھے ۔ محرم کے زمانہ مین ہر گھر مین یہی حالت رہتی تھی ۔

کچھ مشہور طوائفین بھی ایسی تھین کہ محرم کے آتے ہی لوگ ان کے مرثیے سننے کے لئے بے قرار ہو جاتے تھے ۔ اِمام باڑون مین اور گھرون مین یہ طوائفین مرثیہ پڑھنے کے لئے بلائی جاتی تھین۔ اس کے علاوہ یہ خود اپنے مکانون پر بھی مرثیے سناتی تھین ۔ اِمام باڑون مین تو ہجوم کا یہ عالم ہوتا تھا کہ بیٹھنے کی جگہ نہین ملتی تھی ۔ فسانہ آزاد مین اس کا ذکر بھی

ملتی ہے ۔

" اب جلے تن کو شوق چرایا کہ ارباب نشاط کے
امام باڑون کی زیارت کرین ۔ پہلے تو میان آزاد
جھجکے اے حضرت خدا خدا کیجئے بندہ ایسی
جگہ نہ جانے کا ۔ اپنی وضع کے خلاف ہے ۔
جلے تن ۔ بھئی واللہ کتنے روکھے پھیکے آدمی
ہو۔ارے میان حیدر جان کی نازک آوازی، مشتری
کی جادو طرازی، گوہر کی چمک دمک، ابادی کی
رخ انور کی جھلک سے کانون کو سرور آنکھون کو
نور نہ حاصل ہوا تو لکھنئو کا محرم کیا خاک
دیکھا ۔ اور پیرومرشد خدا اور رسول آگاہ ہے کہ
انہین دس دن تو مزے سے جہان چاہے جائیے
رنگین کمرون پر دو گال ہنس بول آئیے ------
------پہلے گوہر کے ہان پہونچے اللہ اللہ
دماغ عرش برین پر ہے ۔ اچھے اچھے رئیس زادے
فخریہ مصاحبت کر رہے ہین ۔ ایک بڑے مالدار
جوہری صاحب مٹکتے ہوئے آئے ۔ دس روپیہ کی
کارچوبی ٹوپی زیب سر ۔ فالسئی اطلس کا فوق
البھڑک و گلا زیب پر ۔ سنہری لیس ٹکی ہوئی

یکرنگ جوڑا ۔ خاصے مرغِ زرین بنے ہوئے، خدمتگار
کے کاندھے پر زنگاری دو شالہ، بہ وضع بہ قطع
مگر بیٹھتے ہی ٹوکے گئے بیٹھے تو صریح کی طرف
پشت کر کے۔ صاحب خانہ نے ایک عجیب ادائے
دلربا سے جھڑک دیا ۔ اے واہ بڑے خوش تمیز ہو
صریح مبارک کی طرف پشت یا سیدھے بیٹھئے آدمیت
کے ساتھ ۔ میان آزاد نے چپکے سے دوست کے
کان مین کہا لاحول ولا ارے میان یہ با این ہمہ
ٹیم ٹام گھڑکے گئے اور ذرا چین بجبین نہ ہوئے
پیشانی پر شکن تک نہ آئی ۔
دوست ۔ بھائی جان ۔ گوہر جانِ لکھنو شانِ
لکھنو آن بانِ لکھنو ہے ۔ رگ رگ مین شوخی ۔
قد وقامت آفت کا ٹکڑا تمام ۔
قیامت کرے جسکو جھک کر سلام
ایسا خوش قسمت کوئی ہو تو لے کہ اس بت عربدہ
جو کی گھڑکی سہمے کل حاضرین ادب شے گردن
جھکائے بیٹھے ہین جیسے دیکھو دزدیدہ نگاہ
محو نظارہ بازی ہے ۔ لیکن رعب حسن سے بات
کرتے کلیجہ لرزتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

-----یہان سے درد کی طرح اٹھے تو فرنگی
محل مین حیدر جان کے ہان پہونچے ۔
نکلے خیمے سے جو ہتھیار لگائے عباس
چڑھ کے رہوار پہ میدان مین آئے عباس
اس سوز کو ایسی نازک آوازی سے سا رنگ کی مانجھ
مین ادا کیا ۔ کہ سامعین لوٹن کبوتر ہوئے جاتے تھے
راگ اور راگنی تو اس کی لونڈیون کا نام ہے ۔اہوہوہو
کی صدا ہر درودیوار سے بلند تھی ۔ واللّٰہ کیا
پیارا گلا پایا ہے ۔ میان آزاد کی باچھین کھلی جاتی
تھین ۔ اور گردن تو گھڑی کا کھٹکا ہو گئی تھی ۔
اب پھدک کر منجھو مشتری کے کمرے پر پہونچے ان
کی لفاظی ان کی جادو طرازی' ان کی خوش بیانی
ان کے طرز سوز خوانی کی دھوم ہے ۔ کہ تل
رکھنے کی جگہ نہین ہے ۔
خنجر جو بوسہ گاہ پیمبر پہ چل گیا
اس کو جھنجھوٹی کی دھن مین اس لطف سے
پڑھا کہ سامعین سر دھنے لگے "۔[1]

---

[1] ۔ فسانہ آزاد ۔ جلد اول ۔ صـ۳۸۔

یہ اقتباس طویل تو ضرور ہو گیا ۔ لیکن اس ماحول کی پوری تصویر ہمارے سامنے اس طرح آگئی کہ آنکھوں دیکھا حال معلوم ہوتا ہے ۔ غرض پورے محرم میں یہاں اسی طرح کی رونق نظر آتی تھی ۔

## زیورات اور پوشاک ۔

لکھنؤ والون کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے لئے ہم کو ان کا لباس ان کا رہن سہن ۔ دستر خوان ۔ رسم و رواج وغیرہ کو دیکھنا ہوگا تب ہی ان کی زندگی کی مکمل تصویر ہمارے سامنے آسکتی ہے ۔ اب سب سے پہلے لباس کا ذکر کرتے ہین کہ لکھنؤ کے لوگ کیسا لباس استعمال کرتے تھے ۔ اور لباس کی ابتدا کس نے کی اور کب سے ہوئی ۔

لہ ہندوستان مین سب سے پہلے لباس کی کوئی تراش خراش نہین کی جاتی تھی ۔ بلکہ مرد اور عورت دونون بغیر سلے کپڑے سے اپنے بدن کو چھپا لیتے تھے ۔ سب سے پہلے لباس مین ترقی اس وقت شروع ہوئی ۔ جب ساسانی معاشرت اختیار کر کے بغداد کے عباسی دربار نے شرفائے عرب کے لئے پائجامے اور عبا و قبا اور خوش قطع عمامے ایجاد کیئے ۔ کچھ ہی دنون مین یہ لباس تمام مسلمانون کا ہو گیا ۔ جو مصر سے دریائے سندھ کے کنارے تک پھیلے ہوئے تھے ۔ پھر وہ اس لباس کو لیئے ہوئے ہندوستان آئے ۔ لیکن چونکہ یہان ہم کو صرف لکھنؤ کے لباس سے بحث ہے اس لئے زیادہ تفصیل مین جانے کی ضرورت نہین ۔

پرانے زمانے مین لکھنؤ مین انگرکھے کو بہت اہمیت حاصل تھی ۔ یہ جامہ اور بالا دونون کو ملا کر تیار کیا گیا ۔ اس مین سینے پر چولی قبا سے ملائی جاتی تھی ۔ اور سینہ کھلا رکھنے کی جگہ

---

لہ ۔ گزشتہ لکھنؤ ۔ صـ۲۸۲ـہ

ایک گول اور لمبوترا گریبان بڑھایا جاتا تھا ۔ جس کے اوپر گلے کے نیچے ایک ہلال نما کٹھا لگایا جاتا اور وہ بائین جانب گردن کے پاس گھنڈی کو تکمے سے اٹکا دیا جاتا ۔ چولی نیچی رہتی جو خوب گول اور اونچی کھینچی ہوئی اور چست ہوتی تھی ۔ اس کا داھنی طرف کا پردہ نیچے بغل مین بندون سے باندھ لیتے تھے ۔ چٹ اس مین بالکل نہین ہوتی تھی ۔

[1] " میان جھمن انگرکھے کے بند کھولے گدی
پر ٹھی رکھے کھٹ سے موجود "۔

اس کے اوپر بند ہوتے تھے ۔ اور بندون سے دونون طرف کے پردے سینے کے نیچے بالکل بیچ مین باندھ دئیے جاتے تھے ۔ لیکن تھوڑا سا سینہ اس مین بائین طرف کھلا رہتا تھا ۔ چولی نیچے رہتی تھی ۔ دامن نیچا ہوتا ۔ دامنون کو موڑنے کے بجائے اس مین سنجافی گوٹ لگائی جاتی تھی ۔ نواب زادون اور شوقین مزاج لوگون نے ایک کمر توئی کے بجائے جو چولی کے نیچے بند لگانے کی جگہ پر ہوتی پیٹھون کی وضع کی تین تین کمر توئیان لگوائین اور ان پر کٹاؤ کا کام بنوایا ۔ اس کے نیچے شلوکا پہنا جاتا تھا ۔

" کجل لہٹ کا دھانی رنگا ہوا کرتا اس پر روپیہ
گز والی مہین شربتی کا تین کمر توئی کا چست

---

[1] ۔ فسانہ آزاد ۔ جلد اوّل ۔ صفحہ

انگرکھا گل بدن کا جوڑی دار گھٹنا پہنے، بیسواؤن
کی طرح پٹیان جمائے، عطر عروس لگائے ۔ ٹکیے دار ماشہ
عطر کی ننھی سی ٹوپی آلپین سے اٹکائے، ہاتھون
مین مہندی، پور پور چھلے ۔ آنکھون مین سرمے کی
تحریر، چھوٹے پنجے کا زرد مخملی چڑھوان جوتا
زیب پا کیے ہوئے ایک عجیب لوچ سے کمر لچکائے
پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے چلے آتے تھے "[1]

ایک نواب کا لباس ۔

" اتنے نواب صاحب اندر تشریف لائے وضع سنیئے
جُراب خاکی رنگ کا ۔ گھوٹنا چشت صوفیانہ رنگ ۔
کرتہ سفید فلالین کا اس پر سیاہ بیش بہا
بانات کا وَگلا ۔ اور سبز گرنٹ کی گوٹ ۔ دس
روپیہ کی سلائی گھڑی اور زنجیر طلائی، سیاہ
گرنٹ کی اتو کی ہوئی بانکی ٹکّے دار ٹوپی اور
ایک سفید دُلائی اوڑھے ہوئے پانؤن مین تین
روپیہ کا سیاہ ورانش کا بوٹ ۔ عطر سے از سرتا
پا بسے ہوئے "[2]

---

[1] ۔ فسانہ آزاد ۔ صـــــــہ

[2] ۔ فسانہ آزاد ۔ جلد اوّل ۔ صـــ٦٥٦ـــہ

ان اقتباسون کو مین نے اس لئے دیا کہ اس کو پڑھ کر لکھنئو والون کے لباس کی پوری وضع قطع سامنے آ جاتی ہے ۔ اور ان لوگون کے مزاج اور شوقین طبیعت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے ۔

انگرکھے کو دیکھ کر بعد مین اچکن کی ایجاد ہوئی ۔ اس مین گریبان گول ہوتا تھا ۔ اور انگرکھے کی طرح سے اس مین بھی سینے پر پردہ لگایا جاتا تھا ۔ مگر وہ پردہ داھنی طرف قوس نما بوتامون سے اٹکایا جاتا تھا ۔ اس مین داھنی جانب گلے کے پاس سے بوتامون کی ایک خوش نما قوس گولائی لیتی ہوئی کوڑی تک اتی تھی ۔ اور اس کے مقابل دوسری طرف کی قوس کو اصلی قبا مین سی دیا جاتا ۔ پھر انگریزون کی آمد سے کوٹ اور پتلون کا بھی رواج ہو گیا ۔

سر پر ٹوپی کئی طرح کی ہوتی تھی ۔ عام لوگ دو پلڑی ٹوپی استعمال کرتے تھے ۔ پگڑی کا استعمال بھی بہت زیادہ تھا ۔ ان پگڑیون کے رنگ الگ الگ ہوتے مثلاً محررّون کی سفید ململ کی' ہرکارون کی لال' اور چوبدارون کی سفید جس مین داھنی طرف مقیش کا پھول بنا ہوتا تھا علمائے شیعہ کی دو پلڑی ٹوپی کی سیون نیچی اور ایک کان سے دوسرے کان تک ہوتی تھی ۔

نوابون اور جاگیردارون کے کپڑون پر قیمتی مقیش اور گوٹے کناری کے کام بنے ہوتے تھے ۔ جن پر کافی روپیہ صرف ہوتا ۔ ریشم کی کڑھائی ہوتی تھی ۔ لکھنئو کا کار چوبی کام بہت مشہور ہے ۔ اس کا رواج

یہان بہت تھا ۔ پاؤن مین سلیم شاہی جوتا ۔ کاندھون پر رومال ڈالتے یا پھر ہلکی چادر اوڑھے رہتے اور پگڑی بھی باندھتے تھے ۔ ہاتھون مین انگوٹھیان سرمہ، مسّی ۔ ہار پھول اور دیگر خوشبوجات کا استعمال بھی کثرت سے کرتے تھے ۔

[1] یہ تو مردون کے لباس ہوئے ۔ عورتین پہلے ڈھیلے پائچے کے پائجامے پہنتی تھین ۔ ان پائجامون کے پائچے اتنے بڑے ہوتے تھے کہ ان کو چُنت دے کر باندھ دیا جاتا تھا ۔ امیر زادون اور نوابین کی بیگمات کے پائجامے اور بھی زیادہ بڑے ہوتے تھے ۔ جس وقت وہ چلتی تھین تو ان کے پائچون کو باندیان پیچھے سے پکڑ کر چلتی تھین ۔ پھر فرش اور قالینون پر چلتے وقت یہ پائچے لہراتے جاتے تھے ۔ پھر کچھ عرصہ بعد یہ پائچے تنگ مہری مین تبدیل ہو گئے ۔ ان کا گھیر تو ڈھیلا ڈھالا ہوتا تھا ۔ مگر گھٹنون تک تنگ ہوتے تھے ۔ پھر آہستہ آہستہ ان کا اوپر کا گھیر کم ہوتا گیا ۔ اور مہریان تو اتنی تنگ ہو گئین کہ پہنتے وقت یا اتارتے وقت ان کو نیچے سے کھولا جاتا، یا پاؤن مین کاغذ وغیرہ لگا کر پھر چڑھایا یا اتارا جاتا تھا ۔ اور اگر کھول کر پہنتے تو بعد مین ان ٹانکون کو پہننے کے بعد سیا جاتا تھا ۔ ابتدا مین مسلم بیگمات کے لباس مین یہی تنگ مہری کا کھینچا ہوا پائجامہ، سینے پر چھوٹی اور تنگ استینون کی کھنچی ہوئی انگیا ہوتی تھی ۔

---

[1] ۔ بیگمات اودھ ۔ صـــــ

پیٹ اور پیٹھ چھپانے کے لئے ایک کرتی ہوتی تھی، جس کا گلا اس طرح سے کاٹا جاتا تھا ۔ کہ انگیا اس سے بالکل علیحدہ اور نمایاں نظر آتی تھی ۔ دو لمبے بندون سے اس کو باندھ لیا جاتا۔ اس طرح پیٹ اور پیٹھ دونون چھپ جاتے تھے ۔ پھر اس کے اوپر تین گز کا ڈوپٹہ چنا ہوا باریک اوڑھا جاتا تھا ۔ اس کو سر کے اوپر لا کر اس طرح اوڑھا جاتا کہ جسم کا حصہ نظر نہ آئے ۔ بعد مین چل کر یہ تبدیلی ہوئی کہ ڈوپٹہ صرف شانون پر پڑا رہتا تھا ۔ کچھ عرصہ کے بعد ساڑھی کا رواج ہو گیا ۔ پاؤن مین سلیپر اور اونچے گھرانون مین یا کسی خاص محفل مین اعلیٰ درجہ کے شوز پہنے جاتے تھے ۔

کپڑون کے ساتھ زیورات بھی طرح طرح کے ہوتے تھے ۔ کان ۔ ناک ۔ گلا ۔ ہاتھ ۔ پاؤن ہر ایک کے کئی کئی طرح کے زیور جڑاؤ اور سادہ بنائے جاتے ۔ یہ زیور سونے چاندی اور قیمتی موتیون اور نگون کے ہوتے تھے ۔ غریب لوگ پیتل کے بھی استعمال کرتے تھے ۔ فسانۂ آزاد مین ایک دولھن کا ذکر ملاحظہ ہو جس سے ان تمام زیورون اور لباسون کی تفصیل سامنے آ جاتی ہے ۔

" عروسی لباس اور عطر سہاگ کی بوباس تارکشی،
کا بیش بہا دوپٹہ اوڑھے، سنہرے پلّے دو دو
بالشت کے لٹکتے ہوئے اور موتیون کی بیل، پائجامہ
فوق البھڑک تماوی پر زرد وزی کا کام کیا ہوا ۔
قمیص مرصع ازار بند پڑا ہوا ۔ پانچ ہزار کی ادگی

جواہرات کے گھونگرو ۔ ہیرا نگینے جڑے ہوئے
مقیش کی جھالر سر پر جڑاؤ چھپکا ۔ جبین مین
پر افشان جنی ہوئی ۔ جڑاؤ ٹیکا ۔ کارچوبی
موباف، اس پر جواہرات جڑے اور کرن ٹکی ہوئی
چوٹی مین شیس پھول، ناک مین طلائی نتھ، ۔
جس کے موتیون کی قیمت اچھے اچھے جوہری
نہ لگا سکین، لڑی ۔ گوش صنا گوش مین مرصع
پتے ۔ بال بجلیان، کرن پھول ۔ جھالے ۔ اوراح
مروارید کے بالے ۔ گلوئے مصفا مین طوق، ہیکل،
چندن ہار، دو لڑا ۔ چمپا کلی ۔ ڈھولنا ۔
تعویز ۔ بازو پر نو رتن ۔ جوشن ۔ بھیج بند ۔
مٹھیان گورے گورے ہاتھون مین کنگن ۔ چوڑیان ۔
کڑے ۔ لچھیان ۔ بیڑیان ۔ ہور ہور جھلّے آرسی
پاؤن مین جھلّے ۔ پازیب ۔ جھاگل ۔

یہ تو ایک شاہی دولھن کا زیور اور لباس ہوا ۔ لیکن اگر کوئی غریب اور کم حیثیت شخص ہوتا تو اس کی دولھن بھی قریب قریب ایسے ہی زیور ۔ ۔ پہنے ہوتی تھی ۔ لیکن یہ زیور پیتل یا پھر معمولی موتیون کے ہوتے تھے ۔ اس اقتباس کو پڑھ کر اس زمانہ کے لباس اور تمام زیورات کے نام اور اقسام معلوم ہو جاتے ہین ۔

---

سلہ ۔ فسانہ آزاد ۔ جلد سوم ۔ صـ۱۱۱ـــہ

## طعـــام ۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ لکھنؤ نے دسترخوان اور باورچی خانہ مین کیا کیا جدتین کین ۔

اودھ کے تمدن کی تاریخ کا زمانہ شجاع الدّولہ کے اخیر عہد سے شروع ہوا ۔ جب بکسر کی لڑائی مین اُن کو شکست ہوئی ۔ تو وہ انگریزون سے معاہدہ کرنے کے بعد خاموش ہو کر بیٹھ رہے ۔ فوجی سر گرمیان جاتی رہین قدرتی امر تھا کہ اب ان کی توجہ زندگی کے دوسرے پہلوؤن پر مبذول ہو ۔ شجاع الدّولہ اور ان کی بیگم ساتھ کھانا کھاتے تھے کھانا انواع و اقسام کا پکتا اور باورچی کو بہو بیگم کی ڈیوڑھی پر دے جاتا ۔ اور ہر خوان پر اپنی مُہر بھی لگا دیتا ۔ ان کھانون مین پر قریب قریب بیس ہزار روپیہ سالانہ کی رقم صرف ہوتی تھی ۔ ان کھانون مین اگر ذرا بھی کمی نکل آتی تو نواب بے حد ناراض ہوتے اس لئے کھانون کو بہت احتیاط اور توجہ سے تیار کیا جاتا تھا ۔ دسترخوان کو اس طرح سجایا جاتا ۔ اس کو دیکھ کر ہی بھوک کھل جائے ۔ آصف الدّولہ کے زمانے مین بھی کھانون کا زبردست اہتمام ہوتا تھا یہی وجہ تھی کہ لکھنؤ مین باکمال باورچی خاصی تعداد مین موجود تھے ۔ دوسرے شہرون سے بھی ماہر باورچی یہان آگئے تھے ۔ کھانون مین طرح طرح کی ایجادین ہونے لگین مثلاً باہر سے ایک ایسا باورچی آیا کہ جو

بادام اور پستے کو اس طرح کاٹتا کہ پستے بالکل دال کی شکل کے اور بادام چاول کی شکل کے ہوتے تھے ۔ اور جب ان دونون کو ملا کر وہ کھچڑی تیار کرتا تو بالکل دال چاول کی کھچڑی معلوم ہوتی تھی ۔ اسی طرح ایک باورچی نو رتن پلاؤ پکاتا تھا ۔ اس مین چاولون کو رنگ کر وہ اس طرح ملاتا تھا کہ ان کی صفائی اور آب و تاب دیکھ کر وہ بالکل جواہرات معلوم ہوتے تھے ۔

اس کے علاوہ کئی طرح کے پلاؤ پکتے تھے جن مین نمکین اور میٹھے دونون قسم کے ہوتے تھے ۔ ان کے نام بھی دلچسپ تھے مثلاً موتی پلاؤ، انار دانہ پلاؤ، نو رتن پلاؤ، چنبیلی پلاؤ، نور پلاؤ، گلزار پلاؤ وغیرہ ۔ اسی طرح کئی قسم کی روٹیان ہوتی تھین ۔ سادہ روٹی ۔ میٹھی روٹی ۔ نمکین روٹی ۔ پراٹھے ۔ شیر مال وغیرہ ۔ کئی طرح کے قورمے اور گوشت کے دوسرے سالن ۔ پائے ۔ نہاری ۔ شامی کباب، کوفتے اور پسندے وغیرہ ۔ پھر طرح طرح کی ترکاریان ۔ حلوون مین انڈے کا حلوا، گاجر کا حلوا، بیسن کا حلوا وغیرہ وغیرہ نیز فیرینی اور شاہی ٹکڑے ۔ فسانہ آزاد مین ایک دعوت کا ذکر ہے ۔

" کوئی دوسرا قورمہ ہو ۔ ایک تین پاؤ کی سیخ
اور شامی کباب اور کوئی سیر بھر کی پلاؤ اور
دھنیئے کا دو پیازہ اور کچھ پراٹھے اور نان
پاؤ ہون "

فسانہ آزاد مین تو جگہ جگہ اس قسم کے کھانون کا ذکر ہے۔ کیونکہ یہان کے نوابین اور اُمراء ہی نہین بلکہ عام لوگ بھی کھانون کے بہت شوقین تھے ۔ شکار کے گوشت کا ایک جگہ ذکر ہے ۔

" نواب قمر رکاب اور ناظورہ، یوسف جمال مشتری
تمثال نے، شب کو ہرن کے کباب، ہریل اور چھے
کا گوشت خرگوش کا سالن بارہ سنگھے اور پاڑھے
کے انواع و اقسام کے کباب خوب چکھے ۔شکاریون
نے شکارکاانبار لگا دیا ۔ ان کے خیمے کے اِردگرد
ہر درخت کے نیچے جانور بندھن رہے تھے ۔ کوئی
ہرن کی ران بھون رہا تھا ۔ کوئی خرگوش پر چھری
تیز کر رہا تھا ۔ کوئی ہریل کے کباب مزے سے
چکھتا ہے ۔ کوئی چھون پر دانت لگائے ہے "۔

---

فسانہ آزاد ۔ صـــــ ـــــ ۔

گھرون کے اندر خواتین بھی بڑے اہتمام سے کھانا کھایا کرتی تھین ۔ حسن آرا کے گھر کا دسترخوان دکھاتے ہین ۔

" اتنے مین آٹھ بجے اور نورن نے آکر عرض کیا
کہ حضور خاصہ تیار ہے ۔ حکم ہوا نکالو ۔
پیش خدمت اور خواصین حکم پاتے ہی اٹھین ۔
باورچی خانے گئین، خوانون مین رکابیون اور
کابین لگانی شروع کر دین، ایک خوان مین پیالے
لگائے، کسی مین شیر مال اور پراٹھے، کسی مین
دوغ اور کباب و پلاؤ وغیرہ ۔ کسی مین اچار مربا،
خوانون مین خوانچے ڈھکے اور خوان پوش ڈھانپ
کر عرض کیا، حضور کھانا نکالا گیا ۔ خواصین سلفچی
آفتابہ لائین ہاتھ دھلایا ۔ ایک خواص نے دسترخوان
بچھایا ۔ اور دوسری نے دسترخوان کے چارون
طرف اگّے روشن کئے ۔ پیش خدمتون نے دسترخوان
پر پیالے چننے شروع کئے ۔ جب چن چکین تو آداب
بجا لائین اور ہٹ گئین ۔ آبدار خانے والی صراحی
اور گلاس لے کر بارب کھڑی ہوئی سب نے بسم اللہ

---

ــــہ ۔ فسانہ آزاد ۔ جلد سوم ۔ صـ۹۰۵ــــہ

کہہ کر کھانا تناول فرمانا شروع کیا ـــــــ ـ ادھر
بڑی بیگم نے حکم دیا کہ کھانا بڑھاؤ ـ مغلانیون
نے خوانون مین قاب اور رکابیان لگا کر کھانا بڑھایا ـ
ایک پیش خدمت دسترخوان اٹھا کر لے گئی ـ ایک
خواص تشلہ لائی ـ دوسری بیسن دانی لئے کھڑی
تھی ـ پہلے بیگم صاحب نے گرم پانی سے ہاتھ
دھویا ـ اس کے بعد لڑکیون نے ـ خواص نے دست
پاک حاضر کیا ہاتھ پونچھے ـ خواصون نے پاندان
کھولا ـ اور خاصدان مین گلوریان رکھ کر سامنے
حاضر کیا ـ بھنڈی خانے والی پیچوان تیار کر کے
لائی ـ بیگم صاحب پلنگڑی پر لیٹ کر مشک بو اور
دھوان دھار پیچوان پینے لگین "ـ

اس اقتباس کو پڑھ کر پوری تصویر اور کھانے ہمارے سامنے آ جاتے ہین ـ ہر اونچے گھرانے مین نوکرانیان خاصی بڑی تعداد مین ہوتی تھین ـ کھانا پکانے پر الگ کھانا لگانے اور گھر سجانے پر الگ ـ لباس اور سنگھار پر مشاطہ الگ غرض بڑی تعداد مین مغلانیان ـ مہریان ـ باندیان ہوتی تھین ـ اور ان کے بھی بڑے دماغ ہوتے تھے ـ کیونکہ وہ سمجھتی تھین کہ ہم اتنے بڑے رئیس یا نواب کے خدمتگار ہین ـ

---

ـلہ ـ فسانہ آزاد ـ جلد سوم ـ صـ۳۹۶ تا ۳۹۷ـ

اخلاق ۔ آداب ۔ نشست و برخاست

نشست کے لئے اس زمانے مین کرسیان توشاذ ہی ہوتی تھین ۔ اس لئے لوگ اپنے گھرون مین فرش اور تخت استعمال کرتے تھے۔ فرش جس کی جیسی حیثیت ہوتی تھی ویسا ہی رکھتا تھا ۔اچھے قالین قیمتی فرش ۔ فرشون پر گاؤن تکیئے لگے ہوئے جو خوبصورت اور قیمتی کپڑے کے ہوتے ۔ یہ تو اُمراء ہی کے یہان نظر آتے تھے ۔ فرشون پر اگالدان اور خاصدان ایک جانب رکھے ہوئے ہوتے تھے ۔ خاصدانون مین پان لگا کر رکھ دیتے تھے۔ الائچی سونف گری وغیرہ بھی اس مین رہتی تھی ۔ پان اور حقّہ کا استعمال ہر گھر مین ہوتا تھا ۔ اُمراء کا حقہ فرش پر ہردم تازہ کیا رکھا رہتا تھا ۔

گھر مین کوئی مہمان آتا تو اس کو گاؤ تکیہ سے لگا کر بیچ مین بٹھایا جاتا تھا ۔ کوئی عورت مہمان ہوتی تو پان تمباکو سے اس کی خاطر کی جاتی تھی اور مرد ہوتا تو پان حقہ وغیرہ سے اسکی خاطر کی جاتی تھی اپنے مہمانون کو دیکھ کر فوراً کھڑے ہو جاتے اور دروازے سے انکو لے کر آتے اور رخصت کرتے وقت دروازے تک پہنچانے کے لئے جاتے تھے ۔ مہمان اندر آ کر جب تک پہلے خود نہ بیٹھ جاتا میزبان کھڑا رہتا اس سے بہت تہذیب اور ادب سے گفتگو کرتے ۔ اپنے چہرے کو بشاش بنائے رکھتے تاکہ مہمان کو یہ گمان نہ ہو کہ ہمارے آنے سے میزبان خوش نہین ہے ۔[1]

---

[1] ۔ اردو شاعری کا سماجی پس منظر ۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین ۔صفحہ ۔ مضمون ۔ لکھنؤ کے تمدن و ادب کا جائزہ

مہمان سے ایسی بات نہ کرتے جو اس کو ناگوار گزرے ۔ اگر اس کے پاس سے اٹھ کر جاتے تو پونچھ کر جاتے ۔ میوہ پھل وغیرہ سے اس کی خاطر کرتے تھے لکھنؤ کا یہ جملہ تو ضرب المثل ہو گیا ہے " پہلے آپ پہلے آپ " اور اسی طرح ریل چھوٹ گئی " ۔ آداب اور تکلف اہلِ لکھنؤ کے مزاج مین اتنا پیدا ہو گیا تھا کہ اپنے نقصان کا بھی خیال نہین رہتا تھا ۔ اگر دوستون کی محفل ہوتی اور کوئی بزرگ تشریف لے آتے تو سب دوست اٹھ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور آداب کرتے تھے ۔ اگر مردون کو زنانے حصّے مین جانا ہوتا تو وہ پہلے اندر خبر کرتے پھر جاتے ۔ شوہر اپنی بیوی سے بے تکلفی سے بات نہ کرتا ۔ دولھن جب تک کئی بچّون کی مان نہ ہو جاتی اس وقت تک شرم و حیا کو ملحوظ رکھتی یعنی بزرگون کے سامنے اپنے بچون کو گود مین نہین لیتی تھی ۔ یہ ساری باتین امراء اور شرفاء امیر اور غریب سب مین مشترک تھین ۔

محفلون مین جس مزاج کے لوگ ہوتے تھے ۔ اسی طرح کی گفتگو بھی ہوتی تھی ۔ مذہب، موسیقی، طب، وضع و لباس، عیش و عشرت۔ کھانا پینا ۔ غرضیکہ جس طرح کے لوگ ہوتے اور جن باتون سے سب کو لگاؤ ہوتا اسی پر گفتگو کرتے تھے ۔ گفتگو مین تمیز اور شائستگی کو ملحوظ رکھتے تھے ۔ سلام کے لئے کئی الفاظ تھے مثلاً تسلیم ۔ کورنس ۔ آداب بندگی وغیرہ ۔ بڑون کو سلام کرتے وقت گردن جھکا کر پیشانی پر ہاتھ رکھتے سلام کے بعد ایک دوسرے کا مزاج پوچھتے ۔ سلام کرنے کا یہ انداز شاہی درباروں سے لیا گیا تھا ۔ کیونکہ شاہی

درباروں میں ایک شخص کو کئی کئی بار جھک جھک کر سلام کرنا پڑتا تھا ۔ وہی انداز اُمراء اور شرفاء کا بھی ہو گیا ۔ سلام کے جواب میں بزرگ شاہانہ وقار کے ساتھ اس قسم کے فقرے کہتے ۔ خوش رہو ۔ جیتے رہو ۔ اقبال بلند ہو، خدا عمر دراز کرے وغیرہ ۔ بات چیت ہمیشہ دھیمے لہجہ میں ہوتی تھی ۔

اپنے مکانوں کو خوب صاف ستھرا اور سجا کر رکھتے تھے ۔ جس کی جیسی حیثیت ہوتی تھی اسی طرح کا سامان بھی ہوتا تھا ۔ نوابوں ۔ رئیسوں کے مکانوں کا تو کہنا ہی کیا تھا ۔ ایک نواب کے مکان کی تصویر یہ ہے ۔

"۔۔۔ ایک نواب کے دولت خانے پر پہونچے
کوٹھی سجی سجائی متعدد کمرے سب آراستہ
و پیراستہ سجے ہوئے دلھن بنے ہوئے ایک
بڑے عالیشان کمرے میں فرش مکلف بچھا ہوا ۔
دوسرے کمرے میں کرسیاں میز آرام جوکیاں
مسہریاں کوچ قرینے سے آراستہ وہ سامان کہ
نظر کو چکا چوند ہو ۔ جس نے دیکھا دنگ
ہو گیا ۔ خوجی اپنے نواب کے تزک و احتشام
کو بھول گئے ۔ جا کر یہ ادب دونوں کے دونوں

---

فسانہ آزاد ۔ جلد اوّل ۔ صـ۴۵۴ـہ

بیٹھے خوجی تو نواب زادون کی صحبت
اٹھائے ہوئے تھے دیکھتے ہی کوٹھی
کی اس درجہ تعریف کی کہ پل باندھ
دیئے " ۔

یہ تو خیر ایک بہت بڑے نواب کا مکان تھا ۔ لیکن چونکہ اور لوگون کے پاس بھی دولت کی کمی نہ تھی اس لئے زیادہ تر مکان اچھی ہی حالت مین بنے ہوئے اور سجے سجائے ہوتے تھے ۔ ظاہر داری اور تصنع چونکہ ہر معاملہ مین برتی جاتی تھی اسی لئے اس کا دخل روزمرہ اخلاق اور آداب نشست و برخاست مین بھی تھا ۔

## شعر و شاعری ۔

لکھنؤ شعر و ادب کا گہوارہ رہا ہے ۔ اس دبستان ادب نے تاریخ ادب اردو مین کتنے ہی ابواب کا اضافہ کیا ہے ۔لکھنؤ مین ظاہرداری اور تصنع تو شروع ہی سے بے حد تھی ۔ عورت مرد کے اعصاب پر ضرورت سے زیادہ سوار تھی ۔ اس لئے وہان کے شعر و ادب مین بھی یہ نسائیت یہ تکلف یہ تصنع حاوی ہو گیا ۔ شاعری زلف دوتا اور خم ابرو کی تعریف و توصیف کرنا ہی رہ گئی ۔ اس تکلّف و تصنع کا اظہار خود شاعرون کی ذات اور سامعین کی داد سے بھی ہوتا تھا ۔ منبر پر شعراء کے فرشی سلام اور سامعین کے شعر کو بغیر سمجھے بوجھے احسنت مرحبا کے غلغلے بلند کرنا اس کا ادنی ثبوت ہین ۔ سرشار نے ان داد چاہنے والون اور داد دینے والون کی ذہنیت کا مضحکہ جگہ جگہ اڑایا ہے ۔ ایک مشاعرہ کا تذکرہ اس ڈھنگ سے کرتے ہین ۔

" [1] فصحائے گرانمایہ کو مژدہ تازہ اور شعرائے بلند پایہ کو نوید بے انداز ہے کہ ۳۱ فروری کو روز ادینہ وقت شام نواب بلیغ الدولہ بہادر

---

[1] ۔ رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری ۔ ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب ۔ باب ہشتم ۔ سرشار کے ناولون کی فضا ۔ صـ۱۵۸

[2] ۔ فسانہ آزاد ۔ جلد اوّل ۔ صـ۲۵۱

کی گلابی بارہ دری میں صحبت مشاعرہ قرار پائی
ہے ۔ خاکسار میر مشاعرہ نے انتظام وانصرام
کارِ خیر میں بڑی محنت مشاقہ اٹھائی ہے ۔
لہٰذا ناظرین تقدس آئین کی خدمات رفیع الرکات
میں بعد خشوع و خضوع التماس عجز احساس ہے
کہ ہر وقت مقررہ، تاریخ معینہ، سو کام چھوڑ کر
مشاعرہ میں قدم رنجہ فرمائیں عزت بخشیں رتبہ
بڑھائیں ----------غرض عجب سمان ہے ۔
بارہ دری کیا ہفت اسمان ہے ۔ فرش مکلف
سے آراستہ اور تکلفات اہل لکھنؤ سے پیراستہ
شمع کافوری نور بخش چشم نابینائے مادر زاد، چہہ
چہہ فصحائے نکتہ پرور کے فیضِ قدم سے آباد،
در و دیوار سے نور برستا ہے ۔ اس زمین کی لطافت
دیکھ کر فلکِ پیر توستا ہے ----------
------غرض کے رات بھیگی اور چاندنی خوب
نکھری، مشاعرہ شروع ہوا ۔

طرّۂ دستارِ کلامِ کلیم

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

شعرائے طلیق اللسان اور فصحائے رنگین بیان کے گلدستۂ اشعارِ لطافت باز نے وہ رنگ اثر دکھایا کہ گلابی بارہ دری مین گلِ لالہ کھل گیا ہے، جسے دیکھو بلبل ہزار داستان کی طرح چہک رہا ہے ۔ کوئی عالم تصوّر مین نرگس غمزہ زن سے چشمک زنی کرتا ہے، کسی کا دل زلف پر شکن کے پیچ و تاب مین پھنسا ہوا ہے ۔ بلبل کی خوش نوائی، گل کی کج ادائی ایک پرانے مردے کو اکھیڑ کر منصور کو از سرِ نو کھینچتا ہے ۔ دوسرا صد ہا سال کے بعد سرمۂ سرور کا گلا دبتا ہے ۔ کوئی دُرِ دندان کے مقابل مین مسلکِ گہر کو بے آبرو بناتا ہے ۔ کوئی رقیب روسیا کو سگِ حضور بناتا ہے ۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ا ہوہوہو ۔ ا ہاہاہا ۔واہ واہ ۔اے سبحان اللّٰہ شاعر نے پورا شعر پڑھا ہی نہین کہ یار لوگ لے اڑے 'حاصل زمین واہ' حضرت کیون نہ ہو ۔ قسم حسین کی قلم توڑ دیئے واللّٰہ آج اس لکھنؤ مین یکتا ہو ۔ ایک پستہ قامت، زیبا اندام، تیز طبیعت ملیح الکلام، شاعر بلگرام تربیت یافتۂ لکھنؤ نے، طرح کے مصرع پر ایک غزل پڑھی جس کا ایک شعر درج ذیل ہے ۔

ہم کو دیکھا تو وہ ہنس دیئے ہین

آنکھ چھپتی ہی نہین یاری کی ۔

سامعین ۔"گاڑی کی" ۔ بارک اللّٰہ کیا نایاب شعر فرمایا ہے ۔"کیا گاڑی کی" اب جیسے دیکھئے غل مچا رہا ہے گاڑی کی گاڑی کی شاعر بیچارہ چیختا ہے کہ حضرت گاڑی نہین یاری کی، مگر غل غپاڑے مین سنتا کون ہے ۔۔۔۔ غرض اس طرح کے مشاعرے جا بجا ہوا کرتے تھے ۔ لوگون کو مطلب بھی معلوم نہین ہوتا، سمجھتے بھی نہین لیکن تعریف ایسے کرتے تھے کہ ان سے زیادہ

کوئی شعر و سخن کا ماہر ہو یا نہ ہو دلدادہ ہو یا نہ ہو اس کے لئے روز محفلون مین شرکت کرنا ضروری اور ان مین شور کرنا گویا لازم تھا ۔ ایک مغنی مین لکھنئو کی زندگی مصروف زندگی تھی کسی کے یہان مشاعرہ ہو رہا ہے ۔ کسی کے یہان کوئی کھیل کھیلا جا رہا ہے ۔ کہین داستان سرائی ہو رہی ہے ۔ کہین شراب و جام کا ذکر ہے ۔ گویا ان لوگون پر کچھ نہ کچھ کرتے رہنا فرض تھا ۔

لیکن افسوس اس رومانی لکھنئو کو جس سرعت کے ساتھ عروج ہوا تھا اسی سرعت کے ساتھ اس کا زوال بھی ہو گیا ۔ واجد علی شاہ کی معزولی نے بساط سلطنت کو الٹ دیا ۔ رومانی زندگی کی رنگینیان آگ کے شعلون کی نذر ہوگئین ۔ اور لکھنئو کی فضا پر افسانوی کیفیتون کے بجائے دھوئین کے بادل چھا گئے ۔ گوکہ کچھ دنون تک مٹیا برج کلکتہ مین اس رنگین زندگی کے اثار نظر اتے رہے ۔ مگر وہ چراغ سحری کی آخری بھڑک تھی اور

خوش در خشید ولے شعلۂ مستعجل بود ۔

( خوب چمکا مگر ایسا شعلہ تھا جو جلد سرد ہو گیا )

# " باب سوم "

## " طوائفوں کی زندگی "

رقص اور طوائف

مکان

لباس ۔ زیورات

اخلاق و عادات

محفلیں

## رقص اور طوائف ۔

گزشتہ دور کے حالات اور واقعات تو تواریخ سے بخوبی معلوم ہو جاتے ہین ۔ لیکن واقعات کیون رونما ہوئے اور وہ کون سی باتین تھین جو پس پردہ ان واقعات کی ذمہ دار تھین ۔ اس کے لئے تاریخ کے صفحات کافی نہین ہوتے بلکہ ہمین اس دور کے تمدّن اور معاشرت کا ہی جائزہ لینا پڑتا ہے ۔ تب ہی آئینے کی طرح تمام چیزین روشن ہو کر سامنے آتی ہین ۔

جس طرح موسیقی کو لکھنؤ مین فروغ ہوا اسی طرح رقص کو بھی قبول عام ملا ۔ گانے ہی کی طرح رقص کو بھی عبادت کا درجہ دیا جاتا تھا ۔ عورتین قدیم زمانے مین مورتیون کے سامنے ناچا کرتی تھین ۔ اس ناچ کو سکھانے کے لئے اسکول قایم کئے گئے تھے ۔ اور یہ اسکول اجودھیا اور متھرا وغیرہ مین قائم تھے ۔ اس کی تعلیم باقاعدہ دی جاتی اور تعلیم دینے والے زیادہ تر مرد ہی ہوتے تھے ۔

شجاع الدّولہ کے زمانے مین تو مجرا کرنے والی رنڈیون کے غول کے غول دوسری جگہون سے آکر جمع ہوگئے تھے ۔ اور جمع ہونے کی وجہ یہان کے لوگون کا شوق ہی تھا ۔ ان کے شوق کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کوئی بھی محفل ہو کسی بھی طرح کی تقریب ہو ناچ گانا ضروری سمجھا جاتا تھا ۔ اور جس محفل مین یہ نہ ہوتا وہ محفل سونی اور بے مزہ رہتی تھی ۔ رقص و سرور کی کثرت سے معاشرہ کا احساس لطافت بیدار ہو گیا ۔ ڈاکٹر اعجاز حسین اپنی کتاب اردو شاعری

کا سماجی پس منظر " مین ایک جگہ لکھتے ہین [1]

" رقص و سرور کی کثرت سے یہ تو ہوا کہ معاشرہ کا احساس لطافت بیدار ہوا نرم و نازک چیزون سے وابستگی زیادہ ہوئی ۔ دلون مین گداز پیدا ہوا ۔ آنکھون کو بصارت کا مزا ملا دماغ کو فن کے سمجھنے کی صلاحیت ملی روح کو بالیدگی نصیب ہوئی ۔ "

لیکن ان خوبیون کے ساتھ ساتھ کچھ خرابیان بھی سماج مین آئین ۔ اور وہ خرابیان تھین طوائفون سے عام دلچسپی عیش اور کاہلی اور زندگی کے حقائق سے بے نیازی ۔

ابتدا مین جس طرح عورتین رقص کیا کرتی تھین ۔ اسی طرح مرد بھی ناچتے تھے ۔ لیکن یہ عورتیون کے سامنے نہین ناچتے تھے ۔ ان مردون کے دو گروہ تھے ۔ ایک تو رہس [2] دھاری ہندو کتھک اور دوسرے مسلمان کشمیری بھانڈ ۔ ان دونون کتھک ناچنے والون مین سے کہین ایک کو زیادہ مقبولیت حاصل تھی اور کہین دوسرے کو یہ مخصوص بستیون اور وہان کے عوام وخواص کے

---

[1] ۔ اردو شاعری کا سماجی پس منظر ۔ ص ۲۶۶

[2] ۔ رہس ۔ اس کو واجد علی شاہ نے ایجاد کیا ۔ رہس کا مطلب سوانگ بھرنا ہے ۔ اس مین مرد ہی عورتون کا لباس پہن کر کام کرتے ہین اس کھیل سے واجد علی شاہ کو بڑی دلچسپی تھی ۔

مزاج پر منحصر تھا ۔ یہ لوگ عام طور سے جو ڈرامہ پیش کرتے تھے اس کے مرکزی کردار کنھیا جی اور مہا دیوی ہوتے تھے ۔ ہر بادشاہ کے دور مین ایک نہ ایک استاد کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی ۔ جیسے شجاع الدّولہ اور آصف الدّولہ کے زمانے مین خوش مہا راج ماہر فن تھا اور ہر طرف اسی کے نام کا بول بالا تھا ۔ اسی طرح سے نواب سعادت علی خان غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے زمانے مین بلال جی پرکاش جی اور دیالو جی وغیرہ اچھے ناچنے والے تھے ۔ محمّد علی شاہ سے لے کر واجد علی شاہ تک پرکاش جی کے دونون بیٹون مدگان پرشاد اور ٹھاکر پرشاد کے ناچ مشہور تھے۔ ان لوگون کے ناچ ایسے ہوتے تھے کہ پوری داستان سمجھ مین آ جاتی تھی۔ اور ہر بات کو سو سو اداؤن اور لاکھون دلفریب اشارون سے بتاتے تھے ۔

کشمیری بھانڈ[1] دوسرون کی نقل کیا کرتے تھے ۔یہ لوگ اپنے گروہ مین ایک نو عمر لڑکے کو لے کر اس کے بال بڑھا لیا کرتے اور اس کو عورتون کا لباس پہنا کر عورت بنا دیا کرتے تھے ۔ پھر وہ بڑے ہی پھرتیلے پن سے ناچتا اور ہر محفل مین زندگی اور زندہ دلی پیدا کر دیتا ۔

ان مردون کا کام تو تماشے دکھانا اور طرح طرح کے رقص پیش کرنا ہی تھا لیکن طوائف کا کام صرف ناچنا اور تماشا دکھانا نہین تھا ۔ بلکہ اس کو تو وہ تمام کام کرنے ہوتے تھے جن کو مرد پسند کرتے ہون

---

[1] ۔ گزشتہ لکھنؤ ۔ صلا۲

طوائف تو اس وقت کی معاشرت کا ایک اہم جز تھی اور اس تہذیب مین ایک مستقل مقام رکھتی تھی ۔ جس دور کا اب ہم ذکر کر رہے ہین یہ وہ دور تھا کہ شمالی ہندوستان مین جہان اُردو رائج تھی ۔ مسلمانون کا راج تھا ۔ دہلی مین شاہان مغلیہ اور لکھنئو مین شاہان اودھ تھے ۔ سیاسی اقتدار یا فوجی طاقت دونون مین سے کسی کو نصیب نہ تھی ۔ کیونکہ دونون ایسٹ انڈیا کمپنی کے باجگزار اور نمک خوار تھے ۔ اگلے زمانون کی طرح شاہی خزانے تو بھرے ہوئے نہین تھے ۔ البتہ لوگون کے پاس باپ دادا کی چھوڑی ہوئی دولت کافی تھی ۔ شہزادون رئیسون اور امیرون کو عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے سوا کوئی دوسرا کام نہ تھا ۔ ہر روز نئے سامان نشاط اور تفریح کی ضرورت ہوتی تھی ۔ ایسی صورت مین ارباب نشاط کی خاص قدر ہونا لازمی تھا ۔

لیکن اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اس کی وجہ محض اُمراء کی عیاشی مزاجی ہی نہ تھی ۔ بلکہ ایک بڑی وجہ اور بھی تھی ۔ اس پر بھی ہم کو نگاہ ڈالنی ضروری ہو گی اور وہ وجہ تھی پردہ کی رسم ۔ پردہ[1] ہندو اور مسلمان دونون مین نہایت سختی سے

---

[1] ۔ تاریخ اودھ ۔ نجم الغنی

رائج تھا ۔ کسی بھی امیر غریب کو اپنی مان اور حقیقی بہن کو چھوڑ کر اور کسی بھی عورت کو دیکھنے کی نوبت نہ آتی تھی ہاں خادماؤں اور نیچ قوم کی عورتوں کا شمار گویا عورتوں میں نہ تھا ۔ شادی کم سنی میں کر دیتے تھے۔ اور اس میں بھی نوجوان کی پسند کو کوئی دخل نہیں ہوتا تھا ۔ شادی کے بعد ہی اپنی بیوی کو دیکھنا نصیب ہوتا تھا ۔ شادی دراصل دو خاندانوں کے خوشگوار تعلقات کو مستحکم اور استوار بنانے کے لئے کی جاتی تھی ۔ نہ کہ دو دلوں کا تقاضہ پورا کرنے کے لئے ۔ طبیعت اخلاق سن اور رجحانات کا کوئی خیال نہ کیا جاتا تھا ۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ خاوند اور بیوی کی عمر میں کافی فرق ہوتا ۔ شادی کے بعد بھی بیوی سے اختلاط برتنے کی اِجازت نہ تھی ۔ بڑوں کے سامنے خاوند کی مجال نہ تھی کہ بیوی سے ہنس بول سکے ۔ نند بھاوجیں بیوی کی قدم قدم پر پاسبانی کرتی تھیں ۔ گویا اس معاشرت میں شوہر اور بیوی کا کسی کے سامنے ایک دوسرے سے کسی قسم کا اظہار محبت کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا ۔ ایسی حالت میں نہ وہ نوجوان لڑکا جس کے دل میں ہزاروں ارمان ہوتے تھے نہ محبت کا کوئی تقاضا کر سکتا تھا ۔ اور نہ کوئی رسم کی پابندی اور سہمی ہوئی کم عمر نادان لڑکی اس کا کوئی مناسب جواب دے سکتی تھی ۔

لیکن انسانی فطرت کو نہ رسم تبدیل کر سکتی ہے ۔

اور نہ مذہب ہی قید کر سکتا ہے ۔ بھوک اور پیاس کو چھوڑ کر محبت انسان کی فطرت کا سب سے اہم تقاضا ہے ۔ کسی تندرست نوجوان کو محض ایک رومانی ہم اہنگی کا حسین خواب دکھا کر تسکین نہیں دی جا سکتی ۔ ہماری سماج کا خلاف فطرت دباؤ صرف یہاں تک کامیاب ہوا ۔ کہ اس نے عشق و محبت کے جنسی لوازمات کو گھروں سے نکال دیا ۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے بازاروں میں نشو ونما پائی ۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے ایک جگہ لکھا ہے ۔[1]

" طبقہ اناث میں صرف طوائف ہی ایک ایسی
ہستی تھی جو نسبتاً سہل الحصول تھی ۔
اول تو پردہ کی سختی عورتوں کو مردوں سے
ملنے نہ دیتی تھی ۔ اور پھر گھریلو عورتوں
میں وہ جاذبیت کہاں جو طوائف میں ہوتی
تھی ۔ اس کے یہاں کا پورا ماحول فارغ البالی
و دلکشی کا نمونہ ہوتا تھا ۔ وہ بذات خود
دل ربائی کے سارے سامان سے اپنے پیکر کو
آراستہ کرتی تھی اس کی اداؤں کے علاوہ
نغمہ ریزی جس طرح دل و دماغ پر اثر
انداز ہوتی ہے ۔ اس کے لئے ہر نکتہ دان

---

[1] ۔ اردو شاعری کا سماجی پس منظر ۔ صـ۱۶۰

کو غالب کا قول یاد آتا ہے ۔ کہ یہ جنّت نگاہ وہ
فردوس گوش ہے ۔ ناز و نیاز کی باتین موسیقی کا لطف
اور خانہ داری کے جھگڑون سے فرصت طوائف کے گھر
کے سوا کہان مل سکتی تھی "

بیوون نے رفتہ رفتہ ان باتون کو جن سے جنسی خواہشات مشتعل ہوتی ہین
ترک کر دیا انھون نے کوشش کی کہ وہ دیویان بن جائین ۔ اور وہ فخر سے
اپنے بارے مین کہنے لگین ۔

عشق کا حال بیسوا جانین
ہم بہو بیٹیان یہ کیا جانین

اس کا نتیجہ جو ہونا تھا وہی ہوا ۔ اس زمانے کے اکثر نوجوان شریف زادون
کے دل پر پہلی بجلی ایک طوائف سے آنکھین چار کرنے پر گری ۔ ان کے
جنسی شعور نے ایک طوائف کی آغوش مین آنکھین کھولین ۔ بیوی محض خاندان
چلانے کا ذریعہ رہ گئی ۔ اور طوائف شوہر کے دل و دماغ کی بلکہ جیب کی
بھی مالک ہو گئی ۔ اور وہی طوائف جو معاشرت مین ہمارے عشقیہ جذبات
کی تنہا مالک بن چکی تھی ۔ ہمارے ادب کی بھی معشوق بن گئی ۔ کیونکہ
اگر دیکھا جائے تو ہمارے افسانون، مثنویون، غزلون کے معشوق مین طوائف کا
کردار اور اس کے خد و خال کافی حد تک نمایان ہین ۔ معشوق کا ہرجائی
پن اور بے وفائی رقیبون کا ہجوم کبھی ظلم و ستم کبھی لگاوٹ کی باتین شوخی
اور طراری ناز اور غمزے یہ ساری باتین ایک طوائف کی سجی تصویر کے گوناگون پہلو ہین

لہ " ایک دوسری بڑی وجہ طوائفون مین جانے کی یہ بھی تھی کہ اس وقت کے لوگون کا اپنے کو محترم و معزز سمجھنے کا شوق اپنے اور بزرگون کی سخاوت و شجاعت کے بیان سے مسرت حاصل کرنے کا خیال شاعری و موسیقی پسندی کا اظہار حسن پرستی کی نمائش ہر ایک جذبہ وہان اسودہ ہو جاتا تھا " ۔ اس لئے کہ طوائف اور سازندے سر و قد تعظیم کے لئے کھڑے ہوتے تھے ۔ طوائف سامنے ہوتی اس کے ارد گرد ساز لیئے ہوئے فنکار اس انداز سے بیٹھے ہوتے تھے جیسے کسی حکمران کے دربار مین درباری بیٹھے ہون زرین گاؤ تکیہ، صاف ستھرا فرش جھاڑ اور فانوس سے کمرہ آراستہ اور منور ہوتا ۔ رئیس اس وقت نواب کی طرح تکیہ کا سہارا لے کر شاہانہ شان سے جلوہ فرما ہوتا جو کچھ اس کی زبان سے نکلتا اس کی تعمیل مین ہر ایک کا سر تسلیم خم ہوتا جو کچھ وہ فرماتا ہر ایک اس پر آمنّا و صدّقنا کہتا جب ساز بجتے راگ چھڑتا تو آنے والا مع اپنے ساتھیون کے موسیقی اور کلام کی داد دیتا اپنی شعر فہمی کا ثبوت دیتا ۔ طوائف بغیر کچھ مانگے ہوئے سب کچھ مانگ لیتی ۔ روپیہ کے علاوہ جان و دل دینے پر بھی رئیس کو عار نہ ہوتا کیونکہ معرکہ حسن و عشق مین بھی وہ اپنے کو مجنون و فرہاد سے کم نہین بتانا چاہتا تھا ۔ یہ سب لذتین دل و دماغ کو ایسا متاثر کرتین کہ بادہ ناب بھی اتنا پر اثر نہ ہو گا ۔

---

لہ ۔ اردو شاعری کا سماجی پس منظر ۔ صفحہ ۲۹۷

طوائف یون تو عرصہ دراز سے ہندوستانی معاشرت کا جزو خاص بنی ہوئی تھی ۔ لیکن دہلی مین اورنگ زیب کے بعد اس طبقہ کا بازار پہلے سے زیادہ گرم ہو گیا بادشاہ وزیر اُمراء سب ہی اس حمام مین یکسان تھے ۔ گویا طوائف سے دلچسپی ایک ایسی روایت بن گئی جس پر عمل کرنا شان امارت و نفاست سمجھی جاتی ۔ واجد علی شاہ کے دور حکومت مین بعض اسباب کی بنا پر یہ مذاق اپنے نقطہ عروج کو پہونچ گیا قیصرباغ کے میلے، مینا بازار کے مناظر، اندر سبھا مین حسینون کی اداکاری، طوائفون کا اجتماع، رقص و سرور کی گرم بازاری، یہ سب ایسے جشن تھے ۔ جو اپنی مثال آپ ہو گئے تھے ۔ ان کے دیکھنے والے مرتے دم تک ان جلسون کو یاد کرتے رہے ۔

طوائفین معاشرت کا یہ راز بھی بخوبی سمجھتی تھین کہ کسی مرد کے دل پر ایک مدت تک قابو پانے کے لئے محض اس کی جنسی آسودگی ہی کافی نہین بلکہ اس مین تہذیب، خوش سلیقگی، شیرین زبانی، حسن کی آرائش اور نشست و برخاست کے جملہ آداب کا بھی کافی دخل ہوتا ہے ۔ لہذا اس کی یہی کوشش رہتی تھی کہ وہ مردون کے لئے محض جسمانی تسکین ہی کا وسیلہ نہ ہون بلکہ ایک حد تک ان کے واسطے روحانی نشاط اور تفریح کا سامان بھی مہیا کرین ۔ اس کوشش مین کامیاب ہونے کے لئے اُنھین اپنی تعلیم و تربیت کا بھی کافی خیال رکھنا پڑتا تھا ۔

مرزا ہادی رسوا کی معرکہ الارا کتاب " اُمراؤ جان ادا "
میں جو ایک طوائف کی سچی سوانح عمری کہی جا سکتی ہے ان تمام باتوں
کا ذکر ہے جو ایک طوائف کو سیکھنا پڑتی تھیں ۔ موسیقی میں تو وہ اتنی
ماہر ہوتی تھیں گویا اس فن کو انھوں نے بالکل اپنا ہی لیا تھا ۔ شعر و
سخن سے بھی ذوق لازمی تھا ۔ اس زمانے میں فارسی زبان خواص پسند تھی
سرکاری زبان بھی فارسی تھی ۔ اسی لئے فارسی غزلوں اور فارسی زبان سے
دلچسپی لینا بھی ان کے لئے بڑا ضروری تھا ۔ بعض طوائفیں مشاعروں میں
بھی شریک ہوتی تھیں ۔ اُمراؤ جان کی ملاقات ہادی رسوا سے ایسے ہی ایک
مشاعرہ میں ہوئی تھی ۔ اسی لئے " اُمراؤ جان " سے ایک اقتباس یہاں دینا
بہتر ہو گا ۔

" اس میں شک نہیں کہ منشی صاحب نے آج کے
جلسے کے لئے بڑے سلیقے سے انتظام کیا تھا
گرمیوں کے دن تھے ۔ مہتابی پر دو گھڑی دن
رہے چھڑکاؤ ہوا تھا تاکہ شام تک زمین سرد
رہے ۔ اس پر دری بچھا کر اُجلی چاندنی کا
فرش کر دیا گیا تھا ۔ کوری کوری صراحیاں پانی
بھر کے کپڑا ڈال کے منڈیر پر چنوا دی گئی تھیں ۔
ان پر بالو کے آبخورے ڈھکے ہوئے تھے برف
کا انتظام علحدہ کیا گیا تھا ۔ کاغذی

ہنڈیون مین سفید پانون کی سات سات گلوریان
سرخ صافی مین لپیٹ کر کپڑے مین بسا کر رکھ
دی گئی تھین ------پھر شعرو و سخن
کا چرچا ہونے لگا ۔
منشی صاحب ۔ تو پھر اہتمام کیجئے بندہ شعر
سنے گا ۔
رسوا ۔ معاف فرمائیے ۔ یہ درد سر مجھ سے نہ ہوگا
منشی صاحب ۔ اچھا وہ مطلع کیا تھا ۔
امراؤ جان ۔۔ مین عرض کیے دیتی ہون ۔
کعبے مین جا کے بھول گیا راہ دیر کی
ایمان بچ گیا میرے مولا نے خیر کی

مرثیہ خوانی مین بھی یہ طوائفین ماہر ہوتی تھین ۔ محرم کے زمانے مین ہر شخص مرثیے سننے کے لئے بے چین رہتا تھا اور ہر مکان سے ان کی دل لبھانے والی آوازین آتی تھین اور لوگ ادھر ہی دوڑے جاتے تھے ۔ فسانہ آزاد مین اس کی تصویرین جگہ جگہ ملتی ہین ۔ ایک جگہ محرم کا ذکر ہے کہ

" یہان سے درد کی طرح اٹھے تو فرنگی محل مین

---

سلہ ۔ امراؤ جان ادا ۔ مرزا ہادی رسوا ۔ صفحہ ۱۸

حیدر جان کے یہان پہونچےکے

نکلے خیمے سے جو ہتھیار لگائے عباس

چڑھکے رہوار پہ میدان مین آئے عباس

اس سوز کو ایسی نازک آوازی سے سارنگ کی

مانجھ مین ادا کیا کہ سامعین لوٹن کبوتر ہوئے جاتے تھے ۔

راگ اور راگنی تو اسکی لونڈیون کا نام ہے ۔ او ہو ہو ہو

کی صدا ہر در دیوار سے بلند تھی ۔ واللہ کیا پیارا

گلا پایا ہے ۔ میان آزاد کی باچھین کھلی جاتی تھین ۔

اور گردن تو گھڑی کا کٹھکا ہوگئی تھی ۔

اب پھدک کر بی منجھو مشتری کے کمرے پر پہونچے ان

کی لفاظی ، ان کی جادو طرازی ، ان کی خوش بیانی ، ان

کے طرز سوز خوانی کی دھوم ہے ۔ ارباب صافی مذاق

کا ہجوم ہے ۔ کہ تل رکھنے کی جگہ نہین ۔

خنجر جو بوسہ گاہ پیمبر پہ چل گیا

اس کو جھنجوٹی کی دھن مین اس لطف سے پڑھا کہ

سامعین سر دھنے لگے ۔" [1]

---

[1] ۔ فسانہ آزاد ۔ جلد اوّل ۔ ص ۳۵ - ۳۴

غرضیکہ طوائفین ہر فن مین طاق ہوتی تھین ۔ ان لوگون کو علم و ادب تہذیب و شائستگی سکھانے کے لئے شروع ہی سے اہتمام کیا جاتا تھا ۔ مولوی صاحب گھر پر درس دینے آتے ۔ امراؤ جان مین رسوا لکھتے ہین ۔

" مولوی صاحب نے بہت ہی شفقت سے مجھے پڑھایا تھا ۔ الف ۔ ب ۔ ختم ہونے کے بعد کریما سا معما ۔ محمود نامہ حرف دان پڑھا کے آمد نامہ یاد کرا دیا ۔ اس کے بعد گلستان شروع کرا دی ۔ دو سطرین پڑھاتے تھے سبق حفظ کرایا جاتا تھا ۔ خصوصا اشعار ۔ لفظ لفظ کے معنی ۔ فقرے کی ترکیب نوک زبان تھی ۔ لکھنے پڑھنے پر بھی محنت کرلی ۔ املا درست کرایا گیا ۔ خط لکھوائے گئے ۔ گلستان کے بعد کتابین فارسی کی پانی ہو گئین تھین ۔ سبق اس طرح ہوتا تھا ۔ جیسے اموختہ پڑھایا جاتا تھا ۔ عربی کی صرف و نحو اور دو ایک رسالے منطق کے پڑھے "[1]

---

[1] ۔ امراؤ جان ادا ۔ ص۶۴

اس اقتباس کو پڑھ کر بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے ۔ کہ وہ بچپن ہی سے تعلیم حاصل کرنا شروع کر دیتی تھین ۔ تاکہ آنے والے لوگون سے بات چیت کرنے خط کتابت کرنے مین اُن کو کسی قسم کی دقت پیش نہ آئے ۔ اور آنے والون کو بھی کسی قسم کی پریشانی نہ ہو ۔

---

## مکان ۔

ان لوگون کے مکان بڑے صاف ستھرے اور خوبصورت ہوتے تھے ۔ ان مین بڑے بڑے دالان کمرے کوٹھریان اور صحنچیان ہوتی تھین ۔ دالانون اور کمرون کی دیوارون پر نفیس اور اعلیٰ درجے کے نقش و نگار بنے ہوتے تھے ۔

اگر کئی طوائفین ایک جگہ رہتی تھین تو سب کے کمرے الگ الگ اس طرح بنے ہوتے تھے کہ اگر کوئی ملاقات کے لئے آئے تو اس کو ایسا محسوس نہ ہو کہ سب لوگون کے درمیان بیٹھا ہے ۔ اُمراؤ جان کے اس اقتباس کو دیکھین تو مکانون کا نقشہ ہمارے سامنے آ جائے گا ۔

" مرزا صاحب خانم کا مکان تو آپ کو یاد ہو گا ۔
کس قدر وسیع تھا ۔ کتنے کمرے تھے ان سب مین
رنڈیان ( خانم کی نوچیان ) رہتی تھین ۔ بسم اللہ
( خانم کی لڑکی ) خورشید میری ہم سنین تھین ۔
ان کی ابھی رنڈیون مین گنتی نہ تھی ۔ ان کے
علاوہ دس گیارہ ایسی تھین جو الگ الگ کمرون
مین رہتی تھین ۔ ہر ایک کا عملہ جدا تھا ۔
ہر اک کا دربار علحیدہ ہوتا تھا ۔۔ خانم کا
مکان تھا کہ ایک پرستان تھا ۔ جس کمرے مین

جا نکلو سوائے ہنسی مذاق گانے بجانے کے کوئی

اور چرچا نہ تھا "۔[1]

ہر جگہ صفائی سے جھاڑو لگی ہوتی ۔ دیوارون پر سفیدی پھری ہوتی ۔ چھت پر اُجلی ۔ سفید چھت گیری کھینچی ہوئی ہوتی ۔ جس کے چارون طرف چنٹ دی ہوئی جھالر لٹک رہی ہوتی ۔ دالان کمرے یا صحن مین تختون کا چوکا ہوتا اُس پر دری اور دری پر سفید بڑّاق چاندنی جو اس نفاست سے کھینچ کر بچھائی جاتی تھی ۔ کہ شکن کا کہین نام نہ ہوتا تھا ۔ چارون کونون پر سنگ مرمر کے گنبد نما میر فرش کے کونون کو دبائے ہوئے ہوتے تھے ۔ تاکہ ہوا سے چاندنی اُڑنے نہ پائے ۔ اور نہ اس مین شکنین پڑین ۔

کمرون مین فرش بچھے ہوتے تھے ۔ اور ان پر بھی خوبصورت سفید چاندنی اور قالین نظر آتے تھے ۔ قدلین کے قریب سرہانے گاؤ تکیے لگے ہوتے ۔ اُن کے قریب اُگالدان رکھا ہوتا تھا ۔ خاصدان ہر وقت تیار رکھا رہتا ۔ پاندان ہر کمرے مین موجود رہتا تھا ۔ تاکہ جس وقت ضرورت ہو استعمال کیا جا سکے ۔ حقّہ سر شام ہی خوشبو مین بساکر تیار کر دیا جاتا اور کمرے مین رکھ دیا جاتا تھا ۔ کمرے کے دروازون پر خوبصورت پردے لٹکائے جاتے تھے ۔ جس پر ہر وقت ماما یا کہادی کھڑی رہتی تھی ۔ اور خاص طور پر اس وقت اس چیز کا زیادہ خیال رکھا جاتا تھا ۔

---

[1] ۔ امراؤ جان ادا ۔ صـ ۵۸ـ

جب کوئی امیر یا رئیس تنہائی مین ملنا پسند کرتا تھا ۔ محفل عام مین اس چیز پر زیادہ دھیان نہ دیا جاتا تھا ۔

روز شام کو جس جگہ محفل ہوتی وہ ایک بڑا حال ہوتا تھا ۔ اور اس پر بھی فرش چاندنی قالین گاؤ تکیہ ۔ اگالدان، خاصدان، حقّہ، ضرورت کی ہر چیز موجود ہوتی تھی ۔ چھتّون پر خوبصورت جھاڑ لگے ہوتے تھے ۔ جھاڑ کے اِدھر اُدھر ہانڈیان لگی ہوتی تھین ۔ سر شام ہی سے کنول جلا دیئے جاتے تھے ۔ تیز روشنی رہتی تھی ۔ کمرے کے ایک طرف طبلے سارنگی اور دوسرے ساز رکھے ہوتے تھے ۔ غرض یہ کہ کمرے کو جنّت کا نمونہ بنانے مین کوئی کسر نہ چھوڑی جاتی تھی ۔

جن طوائفون کی مسّی ہو جاتی تھی ۔ ان کے کمرے الگ ہو جاتے اور وہان پر ضرورت سے زیادہ سجاوٹ کر دی جاتی تھی ۔ نواڑ کے پلنگ ڈوریون سے کسے ہوتے موجود ہوتے تھے ۔ پلنگ پر چھوٹے بڑے تکیہ رکھے ہوتے فرش پر چاندنی اور قالین نقشی پاندان ۔ کمرون مین ہر وقت موجود رہتے تھے ۔ غرض یہ کہ اگر ایک سے ایک خوبصورت چیز اگر اپنے لئے ہوتی تو اس سے بڑھ کر ہی مکان کی خوبصورتی کے لئے بھی ہوتی تھی ۔

---

## لباس و زیورات ۔

جس طرح مکانون کی صفائی اور خوبصورتی کا خیال رکھا جاتا تھا اسی طرح اپنے لباس اور زیور اور بناوٹ پر بھی پورا پورا دھیان دیا جاتا تھا ۔ لباس کی تراش خراش پر نظر رہتی کہ اس طرح کا ہو جس سے لوگون کی نگاہ خود بخود ان کی طرف اُٹھے ۔ اور جب اُٹھ جائے تو ایسے بے خود ہون کہ پھر نگاہ ہٹانے کا ہوش بھی نہ رہے ۔ جسم کی خوبصورتی اور زیادہ بڑھ جائے ۔ اور جسم کے تمام خطوط نمایان ہو جائین ۔

پوشاکون مین طرح طرح کی تراش خراش بھی نکالتی تھین اور اپنے وقت کے فیشن کی موجد ہوتی تھین ۔ جہان کہین جاتی تھین ۔ مجرا کرنے یا ویسے ہی بلانے پر تو جدید سے جدید تر چیز پہن کر جاتی تھین ۔ کپڑون کے رنگ بڑے خوبصورت اور موسم کے لحاظ سے استعمال کرتی تھین تاکہ نگاہون کو بھلے معلوم ہون ۔

اس طرح زیورات بھی نئے نئے اور خوبصورت پہنا کرتی تھین ۔ کان مین خوبصورت بالیے ۔ ماتھے پر ٹیکہ ۔ جھومر ۔ گلے مین حسین ہار ۔ ملا ۔ چمپا کلی اور دوسری قسم کے زیور ۔ ناک مین نتھ ۔ ہاتھون مین کڑے ۔ چوڑیان ۔ پاؤن مین پازیب وغیرہ ہوتی تھی ۔

محرم مین خاص طور پر سیاہ لباس پہنتی تھین اور زیورات کو اتار دیتی تھین ۔ فسانہ آزاد مین ہے ۔

" دوست ۔ کیون یار کیا لکھنو مین زیور پہننے کی
قسم ہے ۔
آزاد ۔۔لاحول ولا قوہ ۔ تم بالکل ہی گنوار ہو ماتم
مین زیور کا کیا ذکر گورے گورے کانون مین کالے کالے
کرن پھول ۔ ہاتھون مین سیاہ سیلی بس کافی ہے"

سیہ سیلی بدست ان نگارے
بشاخ صندلی پیچیدہ مارے

لیکن یہ سادگی بھی عجیب لطف دکھاتی تھی " [1]

محرم مین بال کھلے رکھتی تھین ۔ محرم کے زمانے کو چھوڑ کر عام طور سے جوڑیون مین بڑے بڑے ڈھیلون کے موباف ہوتے تھے ۔ ان کو خوب پیچ دے کر شاطہ کمر پر لٹکا دیتی تھی اور زیادہ خوبصورت بنانے کے لئے اس مین جوڑا لچکا لپیٹ دیا جاتا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ۔ کہ بڑی بھاری اور موٹی موٹی سرتاپا چاندی کی ہے ۔ مانگ مین سنہری یا روپہلی افشان اور ستارون سے نقش و نگار بنائے جاتے تھے ۔

ہاتھون مین اور پاؤن مین مہندی ضرور ہوتی تھی ۔ اور انگوٹھیان پہنے ہوتی تھین ۔ جب ہاتھ سے ناچتے وقت اشارہ کرتی تھین تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی حور ہاتھ نچا رہی ہے ۔ غرض یہ کہ وہ سرتاپا حسن کی ملکہ بنی ہوتی تھین اور دل ربائی کے سارے سامان سے اپنے پیکر کو آراستہ کئے رہتی تھین ۔

---

[1] ۔ فسانہ آزاد ۔ جلد اوّل ۔ صفحہ ۳۵۵

## اخلاق و عادات ۔

اخلاق و عادات کے اعتبار سے ان طوائفوں کا کوئی مقابلہ نہ کر سکتا تھا ۔ ان کا اخلاق بے حد اچھا، مزاج ایسا کہ ہر ایک کے ساتھ شائستگی سے پیش آتی تھیں ۔ ان طوائفوں میں خاص خاص طوائفوں تک تو ہر ایک کی رسائی بھی مشکل ہی سے ہوتی تھی ۔ جس طرح کہ برطانوی اُمراء کے لڑکے اپنی تعلیم حاصل کرنے کے لئے یورپ کی سیاحی کے لئے بھیجے جاتے تھے ۔ اس طرح اس وقت کے رئیس زادے آدابِ محفل سیکھنے کے لئے کسی مشہور طوائف کے سپرد کر دیئے جاتے تھے ۔ گویا ایک طوائف کا مکان تہذیب کا اِدارہ تھا ۔ خاندانی طوائفوں کی زبان ادبی اعتبار سے بڑی اچھی اور مستند سمجھی جاتی تھی ۔ بس یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جہاں بڑے گھرانے کے لڑکوں کے لئے شان ریاست برقرار رکھنے کو گھوڑے گاڑی مصاحب وغیرہ ضروری ہوتے تھے وہاں کسی نہ کسی طوائف سے وابستگی بھی لازمی تھی ۔

یہی وجہ تھی کہ ہر رئیس اپنے یہاں طوائف ضرور رکھتا تھا ۔ اور اس وقت اپنے کو بڑا آدمی نہ سمجھتا تھا جب تک کہ اس کے پاس طوائف نہ ہوتی تھی اور بڑا آدمی تو بڑا آدمی ہر چھوٹا اور مفلس آدمی بھی طوائف کے بغیر نہ رہ سکتا تھا ۔ ہر ممکن کوشش کر کے طوائف رکھنے اور اگر گھر پر نہ رکھ پاتے تو خود ان کے گھر جاتے تھے ۔ وہاں محفلیں جمتی تھیں ۔ اور یہ طوائفیں اتنی شائستگی سے

ان سے پیش آتی تھین کہ اگر کوئی پریشان حال آدمی بھی ان کے یہان پہونچ جاتا تو اس کی طبیعت کی کدورت کچھ ہی دیر مین دور ہو جاتی تھی ۔ وہ خوب سمجھتی تھین ۔ کہ کسی بھی مرد کے دل پر ایک حد تک قابو پانے کے لئے اُن کو کیا کیا کرنا ہے ۔ ان مین حسن کی آرائش اور نشست و برخاست کے آداب، شیرین زبانی، خوش سلیقگی، غرض اسی طرح کا ہر فن موجود ہونا چاہیئے ۔ اگر ان مین کسی قسم کی کمی ہوتی تو استاد اس کو دور کر دیتے تھے ۔ وہ کسی بھی مرد سے ملتین تو ان کے برتاؤ سے یہی معلوم ہوتا کہ یہ بس انہی کو چاہتی ہین اور ان کے بغیر زندگی نہین گزار سکتی ہین ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ایسا نہ کرتین تو پھر ان کا پیشہ کیسے چلتا ۔ ان کا اخلاق دیکھ کر معلوم ہوتا تھا ۔ کہ ان سے زیادہ با اخلاق کوئی دوسری عورت ہو ہی نہین سکتی ہے ۔ میرے سرکار ۔ میرے سرتاج میرے حضور ۔ میرے آقا جیسے القاب سے مردون کو مخاطب کرتی تھین ۔ بول چال مین فارسی زبان اور فارسی شعر استعمال کرتی تھین ۔ بے حد معصوم اور بھولی بن کر جیبون پر ہاتھ صاف کرنا ان کے لئے معمولی کام تھا ۔

محفلین ۔

روز سر شام ہی ان عورتون کو مشاطہ اس طرح سجا دیتی اور خوشبو مین بسا دیتی تھی ۔ کہ ہر ایک کا دل دیکھ کر مچل جاتا ۔ فسانہ آزاد مین ایسی محفلون کا ذکر ملتا ہے ۔ ایسی ہی ایک محفل کا ذکر کرتے ہوئے سرشار لکھتے ہین ۔

" کل شب کو تین بجے تک ایک رنگیلے دوست کے یہان محفل رقص و سرور مین شریک تھا ۔ واللہ وہ پیاری پیاری صورتین دیکھنے مین آئین کہ واہ جی واہ کس کافر کا اٹھنے کو دل چاہتا ہے ۔ جلسہ برخاست ہوا تو بس کلیجے کو دونون ہاتھون سے تھام کر ہم بھی بادل سرد اٹھ کھڑے ہوئے ۔ لیکن دل زلف مہوشان ہی مین پھنسا تھا ۔ رات بھر کانون مین چھما چھم کی آواز آیا کی ۔ پریون کی پیاری پیاری صورت آنکھون مین پھرا کی ۔ ایک ایک جو وہان تھی ۔ دنیا سے نرالی فتنہ زمانہ آفت ڈھانے والی جسے دیکھو نور کا عالم ۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب ۔ مگر وہ چاند سا مکھڑا نہ بھولے گا ہائے مرتے دم تک نہ بھولے گا ۔ زاہد

صد سالہ بھی دیکھے تو اس بت بے پیر کی پرستش کرے ۔

اب اس وقت جھٹ پھٹ پھر جاتے ھین ۔ ذرا آنکھین سینک

آئین ۔ بھیرویں اُڑ رھی ھو گی ۔

رسیلی نینون والیون نے پھندا مارا " [1]

اس اقتباس سے بخوبی اندازہ ھو جاتا ھے ۔ کہ لوگ کس طرح ان محفلون کے شیدائی ھوتے تھے ۔ اور بے چین ھو ھو کر جاتے تھے ۔

جہان طوائفون کو فارسی غزلین یاد ھوتی تھین ۔ وھین مذھب کو مد نظر رکھتے ھوئے ۔ ان کو مرثیے بھی یاد کرائے جاتے تھے ۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ھو گا ۔ کہ مرثیون کا فروغ ھی طوائفون کی سوز خوانی کی وجہ سے ھوا تھا ۔

گھرون مین جن محفلون مین ان کی شرکت ھوتی وہ تو الگ بات تھی ۔ اس کے علاوہ بھی سر شام سے طوائف کے کوٹھے پر ناچ اور رنگ کی محفلین ھوتی تھین ۔ لوگ آنے شروع ھو جاتے ۔ پھولون کے گھنے اور دوسرے تحفے ان لوگون کے ھاتھ مین ھوتے اور کچھ دیر بعد جھومتے جھامتے لٹے لٹائے واپس چلے جاتے تھے ۔ ھر کوٹھے پر ایک نیم برھنہ حسین رقاصہ نظر آتی تھی ۔ جو خوبصورت پوشاک اور زیور سے لدی ھوتی تھی ۔ اور شیرین زبان ھوتی تھی ۔ اور لوگون کا دل لبھانا خوب جانتی تھی ۔ یہی سبب تھا کہ جو یہان آتا وہ ھمیشہ ھمیشہ کے لئے ان کا وائہ وشیدا ھو جاتا ۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر مرد جانتا تھا کہ سارا تماشا جھوٹ ہے ۔ لیکن اس کے باوجود وہ اُنھین کا ہو کر رہ جاتا ۔ اس کو اپنے گھر مین رونق نظر نہین آتی تھی ۔ بلکہ اسے سارے جہان کی رونق اُنھین محفلون مین نظر آنے لگتی تھی ۔

# " باب چہارم "

## " میلے ٹھیلے اور رسوم "

## لکھنؤ کے میلے ۔

اجتماعی مشغلے میلے ٹھیلے اور کھیل تماشے معاشرت کے اہم جز ہوتے ہین ۔ اردو شاعری ان کے ذکر سے بھر پور ہے ۔ اردو مین زیادہ تر شمالی ہندوستان کے میلون وغیرہ کا ذکر ملتا ہے ۔ اور خاص کر ان کا جو شمالی وسطی ہندوستان مین عام تھے ۔ اور ہر جگہ مقبول تھے۔ ان میلون مین سب ہی شریک ہوتے تھے ۔ شمالی ہندوستان مین میلون کے تین بڑے مرکز تھے ۔ آگرہ ۔ لکھنؤ اور دہلی ۔ لکھنؤ اور آگرہ کے میلے ٹھیلے وہان کی نسبتاً پر امن اور خوشحال زندگی کے ترجمان تھے ۔ جبکہ " دہلی مرحوم " کے میلے آئے دن کے حملون اور سیاسی ابتری کے شکار رہے۔ خیر ہمین تو یہان صرف لکھنؤ کے میلون کا ذکر منظور ہے ۔

اٹھارہوین اور اوائل انیسوین صدی کے لکھنؤ مین جو میلے ہوتے تھے ایسے میلے ہندوستان کے کسی دوسرے شہر مین نہین ہوتے تھے ۔ مشرقیت اپنی آخری بہار دکھا رہی تھی ۔ عارضی خوش حالی اور وقتی فارغ البالی نے عوام کو تفریح اور سیر تماشون کی طرف مائل کر دیا تھا ۔ نوابون کی رنگین مزاجی نے ان رجحانات کو اور زیادہ فروغ دیا ۔ اور ان رجحانات نے یہان تک ترقی کی کہ بعض سنجیدہ مذہبی مواقع بھی کھیل

تماشون کی شکل اختیار کرنے لگے ۔ چنانچہ محرم مین ہر سال روشنی پر اور اسی طرح دوسرے لوازمات پر بے شمار روپیہ خرچ کیا جاتا ۔ اور کوئی بھی میلہ ہو لکھنؤ کی تماشگاہون مین ہندو اور مسلمان ہزارون لاکھون کی تعداد مین جمع ہوتے ۔ ہر نو چندی کے موقع پر شاہ مینا صاحب کے مزار پر ہر طبقہ کے لوگ جمع ہوتے اور قوالی اور ناچ اور رنگ کی محفلین منعقد ہوتی تھین جن مین لوگ اپنے رقص کا مظاہرہ بھی کرتے تھے ۔ دوسری طرف حضرت عباس کی درگاہ تھی جہان شعیہ حکومت کی عقیدت مندی کی وجہ سے عوام اور خواص کا بڑا مجمع ہوتا تھا ۔ اسی طرح ہندؤن[1] کا کالی جی کے کے مندر مین ہر ہفتہ ایک میلہ لگتا تھا ۔ جس مین عورتین اور مرد ہزارون کی تعداد مین درشن کرنے آتے تھے ۔ اور بھی کئی طرح کے میلے ہوتے تھے جو یا تو ہفتہ مین ایک بار یا مہینے مین ایک بار ہوتے تھے ۔

---

[1] ۔ کالی جی کا ایک مندر لکھنؤ مین بھی ہے ۔

## چھڑیون کا میلہ ۔

ان میلون مین کسی پیر فقیر یا ولی کے نام پر لمبی لمبی چھڑیان بنائی جاتی تھین ۔ چھڑیون کو رنگ برنگ کے کپڑون سے اور کاغذون سے سجایا جاتا تھا ۔ ایک ایک چھڑی پر پانچ پانچ دس دس بیس بیس جھنڈیان چڑھائی جاتی تھین ۔ لوگ ان کو اٹھا کر جلوس کی شکل مین گاتے بجاتے اور ناچتے ہوئے ایک مقررہ جگہ پر اکھٹے ہوتے اور پھر چھڑیون کو زمین مین گاڑ دیتے تھے ۔ اس مین ہزارون لوگ جمع ہوتے اور یہی ہجوم گویا ایک میلہ کی شکل اختیار کر جاتا تھا ۔ ایسے میلون کا ایک تہذیبی پہلو یہ بھی تھا کہ ان مین ہندو اور مسلمان دونون ہی شریک ہوتے تھے اور آپس مین کسی قسم کا امتیاز نہین برتتے تھے ۔ لکھنؤ مین یہ میلے ۱۹۴۷ء تک جاری رہے ۔

لکھنؤ کے ایسے میلون مین میر حسن کو بھی شریک ہونے کا اتفاق ہوا تھا ان کے تاثرات کی ایک جھلک ان کی مثنوی " گلزار ارم " مین ملتی ہے ۔ میر حسن نے اس مثنوی مین اپنے دھلی سے لکھنؤ تک کے سفر کا حال لکھا ہے ۔ اور مثنوی کے شروع مین میلے کی خوبیون اور رنگ رلیون کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے ۔

---

سلہ ۔ گلزار ارم ۔ میر حسن ۔ سال تصنیف ۱۱۹۲

## " عیش باغ کے میلے "

عیش باغ میلے کی ابتدا آصف الدّولہ کے عہد مین ہوئی ۔ ساون کے مہینے مین ہر جمعہ کو عوام اور خواص جمع ہو کر یہ میلہ مناتے ۔ کچھ عرصہ کے بعد جمعہ کے ساتھ ہفتہ بھی شامل ہو گیا ۔ میلہ نہایت دھوم دھام سے ہوتا تھا ۔ ایک طرف سے اُمراء پیدل سوار معہ رفیقون، مصاحبون، خدمت گارون، کے ہوتے تھے ۔ بڑے بڑے مہاجن مالدار بگھیون پر بیٹھے ہوتے تھے ۔ اس میلے مین کنجڑے ۔ قصائی ۔ دھوبی ۔ جلاہے بھی جمع ہوتے تھے ۔ دوکان دار طرح طرح کی چیزون کی دوکان لگاتے تھے مثلاً دال موٹھ ۔ مونگ جھڑے ۔ پھلکیان ۔ دھی بڑے ۔ کھیر کی ھانڈیان ۔ پونڈے کی گنڈیریان[1] ۔ ہر چیز قرینے سے سجائی جاتی تھی ۔ لڑکے بالے درختون پر جھولا ڈال لیتے تھے ۔ اور ساون کے گیت جھولے پر گاتے تھے ۔ کھیل دکھانے والے سدھائے ہوئے جانورون کے کرتب دکھاتے تھے ۔ مثلاً ریچھ کی لڑائی ہوتی ۔ بندر اور بندریا کا بیاہ ہوتا ۔ سانپون کی لڑائی نیولے کے ساتھ ہوتی اور نٹ حیرت انگیز تماشے دکھاتا ۔

---

[1] ۔ گنڈیریان ۔ گنے کی کٹی ٹکڑیون کو کہتے ہین ۔ یہ لکھنؤ کی خاص چیز ہے ۔ جس کو داستان سناتے وقت اور اسی طرح کے دوسرے میلون مین لوگ چوستے نظر آتے تھے ۔

کھانے پینے کی چیزون مین نان بائی اپنی دوکانون مین پلاؤ، قورمہ، روٹی، بریانی، کباب وغیرہ لئے بیٹھے ہوتے ۔ دوسری طرف افیونی اپنے دوست احباب کے ساتھ افیون کی چسکیان لگاتے ۔ داستان گو گڈیریان چوستے جاتے اور داستان سناتے جاتے ۔ کھلونے والون کی دوکانون پر بچے جمع رہتے اور اپنی اپنی پسند کی چیزین خریدتے ۔ پری پیکر تنبولن پان لگا کر خریدنے والون کو کھلاتی تھین ۔ قاقنین بھاری اور گہرے رنگون کے کپڑے پہنے بناؤ سنگھار کئے دھوان دھار حقے پلاتی تھین ۔ طوائفین گاڑیون پر سوار اپنے حسن کی بہارین دکھاتی تھین ۔ اور لوگون کے دلون پر آرے چلاتی تھین جا بجا لوگ فرش بچھائے حقّہ کی نے منہ سے لگائے یار دوستون مین بیٹھے خوش گپیان کرتے تھے ۔ سحر لکھنوی نے اپنے ایک قصیدہ مین اس کا ذکر کیا ہے ۔

لہ رند وبہار ا گئی پتا ہوئی خزان

جمنا بھی جامنون کی سڑک پر ہوئی روان

اس کے علاوہ فسانہ عجائب مین رجب علی بیگ نے بھی اس میلے کا ذکر بڑے اچھّے الفاظ مین کیا ہے ۔

---

لہ ۔ یہ قصیدہ نواب مصلح سلطان وزیر اودھ کی مدح مین ہے ۔

## آٹھون کا میلہ ۔

یہ میلہ راجہ ٹکیٹ رائے کے تالاب پر منایا جاتا تھا ۔ اول ماہ چیت کی اسٹمی[1] کو لوگ جمع ہوتے تھے ۔ یہان ستیلا دیوی کا مندر بھی ہے ۔ میلے والے دن یہان ہندو مسلم ہزارون کی تعداد مین جمع ہوتے تھے ۔ اور [illegible] عقیدت مند نیاز دلاتے اور چڑھاوے چڑھاتے تھے ۔ [2] (لوگون کا عقیدہ تھا) کہ یہان پر ہر شخص کی مراد بر آتی ہے اور دعا جلد قبول ہوتی ہے ۔ ہجوم کا اس دن یہ عالم ہوتا تھا کہ معلوم ہوتا پورا لکھنؤ یہان آ گیا ہے ۔ رتن ناتھ سرشار نے اس میلے کا ذکر فسانہ آزاد مین اس طرح کیا ہے ۔

" صبح ہی سے میلے کا رنگ جما ہے ۔ نخل بہار کی نشو و نما ہے ۔ غٹ کے غٹ ٹھٹ کے ٹھٹ شہدے لتے ٹورے ٹجیے گرہ کٹ، جیب کترے، جرسیے، مد کیے، گنجوٹیے ۔ بھنگڑ نٹے شریف و عجیب زیرک ولبیب سب جوق جوق اُمنڈ آئے ہین ۔ تامدان، ہوا دار و رہواء باد رفتار، فینس زرنگار، ٹٹو گھوڑا

---

[1] ۔ آٹھون کو اسٹمی کہتے ہین ۔

آٹھون کو کرشن جی کی پیدائش بھی ہوئی ہے ۔

[2] ۔ اودھ کے شاہی میلے ۔ خواجہ عبدالروف عشرت لکھنوی ۔ رسالہ زمانہ ۱۹۲۶ء

سب خرامان خرامان پو قدے آتے ہین ۔ بگھی پر بگھی
ٹوٹی پڑتی ہے ۔ گاڑی سے گاڑی لڑتی ہے ۔ رنگیلون
چھیل چھبیلون کی بن آئی گاڑی بوٹی چڑھائی، بن ٹھن
کے چھیلا بن کے میلہ دیکھنے چلے ۔ بالون مین حِنا
کا تیل چھوڑے یہ کجل لیت کا دھانی رومال اوڑھے
دو انگل مانگ کھولے، بانڈی سے پٹیان جمائے، گھڑی
لگائے، داڑھی چڑھائے، گلے مین گلوبند، دلفریب، شربتی
انگرکھا زیب تن، پاؤن مین مخملی جوتی کاشانی یا سوتی،
قہقہے اُڑاتے آنکھین لڑاتے جا رہے ہین ۔ اِدھر اُدھر
نظارہ بازی کر کے مسکرا رہے ہین ۔ فینس پر ماہرو
ٹھسّے سے بیٹھی ہین مگر بند ہٹو، بچو، کا شور بلند
ساقنون کا بازار گرم کسی نے دوش پٹے ٹکا ہتھیا یا ۔
ساقنون کی دوکانین، دھوان دھار تنبولیون کے بیڑے،
مزیدار کان میلے کی سرگوشی، حجام کی رونمائی، برف
والے کی سرد مہری، سنکرتون کی ہانک، بھولاناتھ
کے باغ کے میلے کا چشم و چراغ ہے۔ ٹکیٹ رائے کا
تالاب ہزارون مین انتخاب لاکھون مین لا جواب "
" جو سلسبیل و کوثر کو شرمائے، تسنیم دیکھے تو
پانی پانی ہو جائے، عجب لطف و سمان ہے ۔

ہزار ہا تماشائی تالاب کے ارد گرد بستر جمائے
کوئی دری، کوئی زین پوش بچھائے، بیٹھا میلہ
دیکھ رہا ہے ۔ کوئی جہانیاں جہان گشت
چکّر لگا رہا ہے ۔ کوئی ہوا کھاتا ہے ۔ ایک
فینس پر ایک نوجوان رعنا ڈھوہ، پچیس برس
کا سِن، چلنے پھرنے کے دن لدا ہوا جا رہا
ہے ۔ کوئی ٹٹو کو ٹخ ٹخ کرتا آ رہا ہے "۔
" عورتیں الگ زیور سے متھلی گھونگھٹ کاڑھے
دبکی چلی جاتی ہیں ۔ کہ کوئی جوہرِدستیاں
نہ موس لے جائے ۔ تخت روان آتے ہیں ۔
سوانگ لاتے ہیں کوئی دھکتا انگارہ کھا گیا
کوئی لوہے کے چنے کر کر کر کے چبا گیا ۔
برہمن ڈول لئے گشت لگاتے ہیں ۔ سقے اور
بہشتی کٹورے کھنکھناتے ہیں۔سہ پہر تک
خوب جمگھٹا رہا، چراغ روشن ہوئے اور یار لوگ
کھسکے کسی نے مٹی کا ببوا لیا کسی نے روئی کا لنگور" [1]

---

[1] ۔ فسانہ آزاد ۔ صفحہ ۔ جلد اوّل

## قیصر باغ کے میلے ۔

واجد علی شاہ کے زمانے تک لکھنؤ ہر اعتبار سے بہت ترقی کر گیا تھا ۔ یون کہنا چاہیئے کہ لکھنؤ اس وقت ہندوستان کے کسی بھی شہر کے لئے لائق رشک تھا ۔ کامرانی اور فراغت کا یہ عالم تھا کہ ہر گوشہ دامان باغبان اور کف گل فروش بنا ہوا تھا ۔ چنانچہ اس زمانے کے میلون ٹھیلون مین بھی اس کا اثر دیکھا جا سکتا ہے ۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے الفاظ مین ۔

" جان عالم پیا کی عشرت گاہ پرستان بن گئی تھی غزالہ ماہرو کرشن لیلا اور اندر سبا کے تماشے ہوتے تھے ۔ ساون کی مست پرہون کے گانے باغون کے جھولے قیصر باغ مین کھڑے بھی رنگے جوگن بھی بنی در در مین پھری سیان کے لئے تانین یہ معلوم ہوتا تھا کہ تمام لکھنؤ جھوم رہا ہے " [1]

قیصر باغ ۱۸۴۸ء مین تعمیر ہونا شروع ہوا اور ۱۸۵۰ء مین بن کر مکمل ہوا ۔ اس کے بننے مین ۸۰ لاکھ روپے خرچ ہوئے اس مین سامانِ آرائش بھی شامل تھا ۔ اس باغ مین جوگیون کے میلے کی ابتدا ۱۳ ذیعقدہ ۱۲۳۹ھ کو ہوئی

---

[1] ۔ کلاسیکی ادب ۔ صفحہ ۱۳۰

اس کا ذکر کرتے ہوئے نجم الغنی تاریخ اودھ مین لکھتے ہین ۔

" اس میلے کے سامان اور تکلفات اور آرائش قیصر
باغ کسی طرح بیان مین نہین آسکتی ۔ جس
کے بازار اور دوکاندار اسی رنگ مین تھے ۔
بنیاد اس میلے کی یہ تھی کہ واجد علی شاہ
کی چھٹی کی آرزو مین ان کی مان نے لڑکپن
مین جوگیا لباس پہنایا تھا اس کی سالگرہ اس
لباس سے ہوتی تھی ۔ بادشاہ نے حدِّ سلطنت
مین میلہ قرار دیا ۔ جیساکہ نادرالعصر مین
مذکور ہے ۔ اور افضل التواریخ مین لکھا ہے کہ
یون سنا جاتا ہے کہ فقیر شناسون نے بادشاہ
سے عرض کیا کہ زائچہ ہمایون مین جوگ کا جوگ
ہے رفع نحوست کی تدبیر واجب ہے اگر عہد
سلطنت مین حالت فقیری اختیار کی جائے تو
نحوست سعادت کے مبدّل ہو جائے بادشاہ
نے بنظر دور اندیشی، انجم شناسون کی تجویز
کے مطابق بزم جوگ آراستہ کی، جوگیا لباس
زیب تن فرمایا، قیصر باغ کو نمونہ بہشت برین
بنایا، ہر روش پر نغمہ سمان پیکر سرخ پوش

مثل حوران بہشتی ترانہ انگیز اور رقاصان زہرہ جبین
لباس ارغوانی کی صدا، کہین نفیری کا شور، کہین جلا جل
کی ندا، کہین آواز بلبلان کا زور چھوٹا بڑا پوشاک سرخ
پہنے تھا ۔ تمام بیگمین اور ان کی خواصین اس مین
شریک تھین ۔ بادشاہ خود جوگیون کا لباس پہنے کرسی
سرخ و زرنگار پر زینت افزا تھے ۔ معشوقہ خاص اور
سکندر بیگم جوگین بنین انیس الدّولہ اور رضی الدّولہ
خاکستری لباس مین شریک جلسہ تھے تماشائیون کا
ہر طرف ازدہام تھا ہر ایک جانب مجمع خاص وعام
تھا ۔ اسّی ۸۰ ہزار وابستگان دامن دولت کو تین روز
برابر طعام خوش گوار عطا ہوا ۔ دربار عام رہا چھوٹے
بڑے لڑکے بوڑھے امیر غریب جوگیا لباس پہنے ہوئے
شریک میلہ ہوئے ۔ وجہ یہ تھی کہ سفید پوش
قیصر باغ مین جانے نہ پاتا تھا ۔ رنگریز امیر ہوگئے"

تاریخ میلہ

بہ تیسر باغ چون سلطان عالم
نمودہ میلہ رنگین و نادر
پئے تاریخ رین فرخندہ جلسہ
ندا آمد نشاط افزائے خاطر

۱۲۶۹ء تک اس جوگیانہ جلسے کا ہر ساون کے مہینے مین دو تین برس برابر رنگ جما رہا [1]

بقول مصنف تاریخ اودھ اس تفریح پر لاکھون روپے خرچ ہوتے تھے ۔ حسینان دلربا پریون کا سا لباس اور زیور پہنتین بازوؤن پر جڑاؤ پر لگائے چلمنون مین جلوہ آرا ہوتین ۔ رقص و سرور کی محفل گرم ہوتی اور ہر تماشائی داد عشرت دیتا ۔ اسی طرح یہ میلہ چند سال تک ہوتا رہا ۔ لکھنوی شاعرون مین سے سحر لکھنوی کو اس میلے سے بے حد محبت تھی ۔ اس کا ذکر ان کے کلام مین مختلف عنوانون اور مختلف پیرایون سے آیا ہے ۔ ایک قصیدہ کے چند شعر ملاحظہ ہون ۔

صدائے نغمہ سے گونجا ہوا تھا سارا باغ
ہر ایک شاخ سے اتی تھی بانسری کی صدا
غزل سرائی بلبل صدائے خندۂ گل
شکست توبۂ زہد و قلقل مینا

---

عجب رنگ کا میلہ تھا واہ رے ایجاد
گلے مین کس کے نہ تھا گیروانیا جوڑا

---

[1] ۔ تاریخ اودھ ۔ جلد نمبر ۵ ۔ نجم الغنی ۔ ص۸۷

قیصر باغ کی ان رنگینیوں اور دلچسپیوں کو قائم ہوئے ابھی تین سال بھی نہ ہوئے تھے کہ سلطنت اودھ کا زوال ہو گیا " جان عالم " واجد علی شاہ لکھنؤ کے در و دیوار پر حسرت کی نظر کرتے ہوئے کلکتے سدھارے اور یہ محفل راشی و رنگ درہم برہم ہو گئی ۔

## گڑیون کا میلہ ۔

یہ میلہ ساون سدی تیج کو گنگنی شکل کے تالاب پر ہوتا تھا ۔ ہندو لوگ اس زمانے مین اپنی لڑکیون کو سسرال سے بلاتے نقد روپیہ اور کچھ ملبوسات حسب حیثیت دیتے ۔ اور کہین یہ رسم تھی کہ لڑکیان کپڑے کی گڑیان بنا کر شام کے وقت اپنے کوٹھے سے نیچے پھینک دیتی اور چھوٹے لڑکے ان کو رنگین لکڑی سے پیٹتے ۔ اس میلہ کا نمونہ لکھنؤ مین کہین کہین اب بھی ملتا ہے ۔ اس میلے مین پہلوان بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے ۔

ساون سدی پورنماشی کو سلونو کا میلہ ہوتا تھا ۔ برہمن لوگ حسب دستور پوجا کرتے دریا پر جاتے تھے ۔ اور ایک ڈورا جس کو راکھی کہتے ہین ۔ اشنان کرنے والون کے ہاتھ مین باندھ کر اور اشیرواد دے کر کچھ پیسے حاصل کرتے تھے اور سہ پہر کو سنیاسی[1] جمع ہو کر پورے سال کی پیشنگوئیان کرتے تھے ۔

---

[1] ۔ سنیاسی ۔ فقیر کو کہتے ہین ۔ سنیاسیون کے دس فرقے تھے ۔

## ڈیہی پاٹن کا میلہ ۔

یہ میلہ اساڑھ کے مہینے میں بلرام پور میں ہوتا تھا ۔ یہاں ہندوستان کا ایک پرانا مندر ہے اس میں پوجا ہوتی تھی ۔ اخر ماہ چیت اور کنوار میں بھی لوگ یہاں جمع ہوتے تھے ۔ خدا کی قدرت سے عجیب عجیب واقعات اس مقام پر ظاہر ہوتے تھے اور یہاں پجاری مدتوں قیام کرتے اور اپنی اپنی مراد پاتے تھے ۔ اور میلوں کی طرح یہاں بھی بڑی رونق رہتی تھی ۔

## ڈیہی پچھاون کا میلہ ۔

" درگا گنج نواب " میں جسے نواب امین الدّولہ بہادر نے آباد کیا تھا چیت سدی چورس کو ایک نہایت شاندار میلہ ہوتا تھا ۔ یہ مقام قدیم سے عبادت گاہ بنا ہوا تھا اور اس مبارک مندر کا نام مکشتھبو تھا ۔ عام لوگ کسہری کہتے تھے اس لئے یہ کسہری کا میلہ کہلاتا تھا ۔ اس میلہ میں صرف لکھنؤ کے لوگ جمع ہوتے اور چار روز تک یہاں قیام کرتے اور طرح طرح کے تماشوں سے لطف اندوز ہوتے ۔

مہاجن بچّے ہتھیار بند آتے تھے اور بکری کے بچوں پر جنھیں پھینٹ چڑھانے کے لئے لاتے تھے شمشیرزنی کر کے اظہار شجاعت کرتے تھے ۔ جگہ جگہ گانے کی محفلیں ہوتی تھیں شہر کی رنڈیاں اس میں شریک ہوتیں شراب و کباب کا شغل کثرت سے ہوتا تھا اور

سب لوگ بشاش نظر آتے تھے ۔

اجودھیا کا میلہ ۔

اودھ تخت گاہ رام تھا ۔ چیت سدی نوی تاریخ ولادت رام چندر جی ہے ۔ اس خوشی مین دور دراز کے لوگ جمع ہوتے تھے اور ہزارون راجہ اور زمیندار پرستش کے لئے اتے تھے اور فیض حاصل کرتے تھے ۔

چھٹہ کا میلہ ۔

بیساکھ سدی چھٹہ کو ہندو لوگ ایک میلہ کرتے تھے ۔ اور اس میلہ مین بھی خوب رونق رہتی تھی ۔ دوکانین وغیرہ لگتی تھین تماشے ہوتے اور لوگ جشن مناتے تھے ۔

---

چیت ۔ ہولی کے بعد کے مہینے کو کہتے ہین مارچ کے بیچ یا آخر مین شروع ہوتا ہے ۔

بیساکھ ۔ یہ مہینہ چیت کے بعد شروع ہوتا ہے ۔

اساڑھ ۔ یہ بھی ایک مہینہ ہے ۔

رسوم -

ملون ٹھیلون کے بعد ہمین لکھنؤ کی ان رسمون پر نگاہ ڈالنی ہے جو اس زمانے مین عام تھین - خوشی اور غمی دونون کے لئے مخصوص رسمین تھین - اور مسلمانون کی امارت نے ان کی عورتون کو دل کھول کر ارمان نکالنے کا موقعہ دیا تھا - ولادت سے لے کر شادی تک لڑکے یا لڑکی کی ہر خوشی و کامیابی ایک تقریب بن جاتی تھی - پیدائش کے بعد ہی چھٹی چھلہ اور درمیان کے نہان عقیقہ، کھیر چٹائی، دودھ بڑھائی، بسم اللہ، روزہ کشائی، ختنہ اور سب سے بڑھ کر عقد نکاح یہ سب بجائے خود شادی کی تقریبین ہین - اکثر لوگ اپنے بچّون کی سالگرہ بھی کیا کرتے تھے سالگرہ کا رواج اور دوسری تقریبات کو دیکھتے ہوئے کچھ کم ہی تھا - ان تمام تقریبون کے علاوہ غسل صحت یا کسی خاص مقصد کے پورا ہو جانے پر خوشی کی غیر معمولی تقریبین ہو جایا کرتی تھین -

ان تمام تقریبون مین عزیز و اقارب اور پڑوسی کی عورتین شامل ہوتی تھین - کسی بھی ایسی جگہ پر محفل کا انتظام کیا جاتا تھا جہان فرش بچھایا جا سکے اور تمام مہمان عورتین اس پر آرام کے ساتھ بیٹھ سکین - اگر کسی امیر گھرانے کی محفل ہوتی تو وہان پر فرش اس پر

چاندنی اور قالین وغیرہ بچھا دیتے تھے ۔ مراثنون کا ہونا لازمی ہوتا تھا
یہ مراثنین عورتون کے سامنے بیٹھ جاتین ان مین ایک مراثن ناچنے والی ہوتی
یہ اپنے پیرون مین گھنگھرون باندھ کر ناچتی اور دوسری تمام مراثنین گاتی تھین
ایک ڈھول بجاتی ناچنے والی ناچتی جاتی اور بھاؤ بتاتی جاتی تھی ۔ اس
طرح کے ناچ کو مجرا کہتے ہین ۔ ان گانون کے درمیان کبھی کبھی ہنسی
مذاق کی باتین بھی ہوتی جاتی تھین ۔ جن لوگون کے یہان رشتہ ہوتا انھین
مراثنین گالیان بھی دیتی جاتی یہ گالیان گانون مین شامل ہوتی تھین ۔
جو رسم منائی جاتی تھی اس مین یا تو خاندان کی بزرگ عورتین یا مراثنین
آگے بڑھ کر رسم کا کام انجام دیتی تھین ۔ مراثنون کو ان کامون کے صلہ مین
خاصی رقم مل جاتی تھی ۔

اکثر تقریبون مین چاہے شادی ہو چاہے عقیقہ یا
ختنہ رت جگا[1] ضرور ہوتا تھا ۔ اس رات کو گگلے[2] پکائے جاتے ۔ جس کی جتنی
حیثیت ہوتی اُسی کے مطابق اُن گگلون کا وزن ہوتا ۔ غریب کے یہان چند سیر
تو امیرون کے یہان چند من ۔ یا گھر کی عورتین ایسے گیت گاتی تھین جو اللہ[3] کے
گیت کہلاتے ۔ صبح

---

[1] ۔ رت جگا ۔ کسی بھی رات کو تقریب کے ہونے سے پہلے سب عورتین رات
بھر جاگتی تھین اور گانا بجانا ہنسی مذاق کرتی رہتی تھین ۔
[2] ۔ گگلے یہ آٹے مین شکر یا گڑ ملا کر بنائے جاتے تھے ۔
[3] ۔ ان گانون مین اللہ تعالی کی تعریف اور اس سے دعا شامل ہوتی تھی

آذانون کے وقت مسجد جاتھن اور انہی گلگلون سے مسجد کے بڑے طاق
ہوتا بھر آتی تھین ۔ " اس رسم کو طاق بھرنا کہتے تھے " رت جگے
کے کچھ دن بعد پھر جو بھی تقریب ہونے والی ہوتی اس کی رسمات
ادا کرتے تھے ہم ان تقریبون کا ذکر الگ الگ کرین گے ۔

## شادی بیاہ کی رسمین ۔

سب سے بڑی اور اہم تقریب شادی یا عقد نکاح ہے یہ وہ ضروری تقریب ہے جس کی بے اعتدالیون کی بدولت سیکڑون خاندان تباہ ہو گئے اور تباہ و برباد ہوتے چلے جاتے ہین وجہ اس کی یہ ہے کہ خوشی کے جوش مین اور تکمیل ارزو کی محویت مین کسی کو نہ اپنی حالت واستطاعت کا خیال رہتا ہے نہ انجام کا ۔ اگلے زمانون مین ان معاملات مین اور بھی شدت تھی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ قرض لیکر جائداد بیچ کر یا جس طرح بھی رقم مل سکے حاصل کر کے ارمان پورے کئے جاتے تھے اور شادی کے ختم ہوتے ہی یہ حالت ہوتی تھی کہ اکثر گھرون مین فاقے کی نوبت آ جاتی تھی ۔

شادی چونکہ انسانی زندگی کا اہم ترین فریضہ ہے ۔ اس لئے اس کو ذرا زیادہ تفصیل سے بیان کرنا چاہئے شادی کی نسبت اکثر مشاطاؤن کے ذریعہ سے ہوتی تھی ۔ ہندوستان کے بڑے شہرون مین بعض عورتون کا یہی پیشہ تھا ۔ مشاطہ اس عورت کو کہتے ہین جو اونچے گھرانون کی خواتین کی کنگھی چوٹی کرتین کپڑے اور زیور پہناتین اور انھین آراستہ کرتی تھین ۔ مگر عام اصطلاح مین مشاطہ ان عورتون کو کہتے تھے جو شادی کا پیغام لیکر جاتی تھین نسبتین ٹھراتین اور شادیان کراتی تھین غالباً اس پیشے کی ابتدا انہی عورتون سے ہوئی جو عورتون کو بنایا سنوارا کرتی تھین

لیکن اخر مین شادی ٹھرانے والی عورتون ھی کا نام مشاطه پڑ گیا ۔ یه بڑی چالاک اور مکار عورتین ھوا کرتی تھین ۔ کسی لڑکے کا پیغام جب لڑکی والے کے پاس لے کر جاتین تو اس کی دولت مندی تعلیم سعادت مندی خوش اخلاقی اور خوبصورتی کی اس درجه تعریف کرتی تھین گویا قسم کھائی ھے که لڑکی والون کی نظر مین اسے مثنوی میر حسن کا شہزادہ بے نظیر ثابت کئے بغیر دم نہین لینگی ۔ اسی طرح جب کسی لڑکی کی تعریف لڑکے والون سے کرتین تو اس کے حسن و جمال، نازو انداز، اور خوبی رعنائی کے ایسے قصیدے پڑھتین که یون معلوم ھوتا که جس لڑکی کا ذکر ھے وہ انسان نہین کوہ قاف کی پری یا شہزادی بدر منیر ھے ۔

مشاطه کے پیغام کے بعد اگرچه تحقیق و جستجو مرد ھی کرتے تھے مگر نسبت ٹھرنے مین زیادہ دخل دونون گھرون کی عورتون ھی کا ھوا کرتا تھا ۔ یه اپنا اطمینان کر کے مردون کی رضامندی حاصل کرتی تھین ۔ اور جن خاندانون مین بچون کی ارمان بھری مائین نسبت ٹھرا لیا کرتین وھان ان کے لئے مشاطه کی ضرورت ھی نہین پیش آتی تھی بلکه دولھا کو بغیر کسی جد و جہد کے ٹھیکرے کی منگی دولھن مل جاتی تھی اور شادی سے پیشتر کی رسمون کی نوبت ھی نہین آتی تھی کیونکه پیدا ھوتے ھی منگی ھو جاتی تھی ۔ ۔

پسند کر لینے کے بعد منگی کی رسم عمل مین آتی تھی ۔ اس مین دولھا کی طرف سے مٹھائی پھولون کا گھنا اور ایک

سونے کی انگوٹھی اور اس کے علاوہ کبھی کبھی کوئی اور بھی زیور جاتا ۔ان چیزون کو دولھا کی مان بہنین بھاوجین خود جاکر پہناتی تھین ۔ منگنی کی رسم کے بعد سمجھا جاتا کہ نسبت ٹھر گئی ۔ اور اس وقت سے دونون طرف کا معمول ہو جاتا کہ جب کوئی تقریب ہو تو سمدھانے مین خاص اہتمام سے حصے جائین اور جو حصہ لڑکی یا لڑکے کا ہو وہ اور زیادہ ہو ۔

نکاح سے کچھ دن پہلے دولھن کو مانجھے بٹھا دیا جاتا تھا ۔ اس وقت اس کو مانجھے کا زرد جوڑا پہنا دیتے اس وقت سے وہ کمرے سے باہر بھی نہین نکلتی تھی ۔ یہان تک کہ باپ بھائیون سے بھی شرمانے لگتی ۔ ایک نائن عورت آکر روز اس کے اُبٹن لگاتی تھی ۔ جس دن دلہن مانجھے بیٹھتی اس کا جھوٹا اُبٹن، اس کی جھوٹی مہندی، مصری کا کوزہ، اور سوجی اور میوے کی پنڈیان ایک شاندار جلوس اور باجے وغیرہ کے ساتھ دولھا کے گھر بھیجی جاتی تھین ۔ جو پنڈیان خاص دولھا کے لئے ہوتی تھین وہ الگ خوان مین نمایان طور پر رکھ کر بھیجی جاتی تھین ۔ اُنھین کے ساتھ دولھا کا زرد جوڑا، ایک رنگی ہوئی چوکی، لوٹا، کٹورا، تیل، عطر وغیرہ شامل ہوتا تھا ۔ یہ چیزین اس ترتیب سے ہوتی تھین کہ باجے والون اور جلوس کے بعد سب سے آگے چوکی اس کے بعد خوانون مین دولھا کی مخصوص چیزین جو عموماً کچے طباقون مین رکھی جاتی تھین ۔ اُن کے بعد بہت سے خوانون مین عام قسم کی پنڈیان ہوتی تھین ۔ دولھن کی چھوٹی بہنین مراثنین فینس اور

ڈولیون پر سوار ہو کر ساتھ جاتی تھین پھر دولھا کے گھر جا کر ایک پینڈی اور مصری کے سات ٹکڑے کر کے دولھا کو کھلائے جاتے ۔ فسانہ آزاد مین مانجھے کے تمام سامان کا بڑی تفصیل سے ذکر ملتا ھے ۔

" اب مانجھے کا سامان گھر آیا پانچ سر کی گنگا جمنی چوکی، نہایت خوبصورت بنی ھوئی۔ سات سو کا مرصع لوٹا ۔ مرصع جام اور کٹورا ۔ چاندی کی سلفچی اور آفتابہ اور لگن، نقرئی چنگیر دان اور پاندان، لالچی سنار، تجربہ کار کے اھتمام مین یہ کل اشیاء نہایت صفائی اور آب و تاب کے ساتھ تیار ھوئی تھین اور اکثر معمر آدمیون کا قول تھا کہ ھم نے اپنی عمر مین اس گرھت کی اشیاء نہین دیکھین سب مین مشہور تھا کہ بڑی بیگم نے اس شادی مین دل کا حوصلہ خوب نکالا ھے ۔ مرصع لوٹا اس مرتبہ لالہ سابول داس نے ایک نئی ترکیب سے بنوایا تھا جس کے دیکھنے کے لئے تمام شہر اُمنڈ آیا تھا ۔ اب پارچے اور زیور کا حال سنیے ۔ کنگنا مرصع مع مروارید ۔ دو ھزار کا ۔ سونے اور چاندی کے جھلے کنگنے مین ڈالے گئے پانچ سو کو

یاقوت کی انگوٹھی، نیمہ جامہ ململ کا بیش بہا

بنارسی پٹکا، زربفت کا پائجامہ انگرکھا ۔ تاج

مندیل، دو شالہ، جیغہ ۔ سر پیچ، نو رتن ہار

دست بند ۔ سات سفید ریشمی رومال ۔ جوڑا

کشتیون مین اور پنڈیان خوانون مین لگائی گئین"[1]

[2] مانجھے کی رسم کے لئے خیال کیا جاتا ہے ۔ کہ یہ خالص ہندی رسم ہے ۔ جس کو نہ عرب سے تعلق ہے نہ عجم سے اس لئے کہ مانجھے اور اس کے ساتھ کنگنے کی ابتدا ہندوستان کے سوا اور کسی جگہ کی نہین ثابت ہوتی ۔

مانجھے کے دس بارہ یا اس سے بھی زیادہ دن کے بعد اسی شان و شوکت اور جلوس کے ساتھ دولھا کے گھر سے دولھن کے یہان سانچق[3] جاتی تھی ۔ اس مین دولھا کے یہان سے دولھن کے لئے چڑھاوے کا جوڑا جو بہت بھاری ہوتا تھا اور دولھن کا سنہری مقیش کا سہرا چاندی کا چھلا، پھولون کا گہنا، سونے کی انگوٹھی دو ایک اور چیزین مثلاً کنگنا، تیل، صابن، تولیہ، سنگھار کا دیگر سامان اور وہ زیور ہوتا تھا جس

---

[1] ۔ فسانہ آزاد جلد چار صـــــہ

[2] ۔ رسالہ دلگداز ۱۹۱۸ء صـ۸۴ـــہ

[3] ۔ سانچق ۔ ترکی لفظ اور ترکی ہی رسم ہے ۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ترک و مغل ہی اس رسم کو ہندوستان اپنے ساتھ لائے ۔ سانچق کو بری کا سامان بھی کہتے ہین ۔

کو پہنا کر وہ رخصت کی جاتی تھی ۔ جوڑے کے ساتھ شکر کے نقل، شکر کے قرص، اور میوہ ہوتا تھا ۔ سانچق کے لئے خاص اہتمام سے مقیش اور رنگین گھڑے تیار کرائے جاتے پھر بانس اور کاغذ کے مختلف رنگون کے تختون مین چار چار گھڑے لگا کر جو گھڑے بنا دیئے جاتے تھے اور دولت و امارت کی شان کی مناسبت سے ان جو گھڑون کی تعداد بڑھتی جاتی تھی اور اکثر سو سو دو دو سو کے شمار کو پہونچ جاتے تھے مگر ان کے اندر چند گنتی کے نقلون یا پاؤ سیر ادھ سیر شکر کے سوا کچھ نہین ہوتا تھا ۔ ان کے منہ پر عموماً سوہے کا کپڑا ناڑے سے بندھا ہوتا تھا ۔ جلوس مین ان سب گھڑون کے آگے چاندی کی ایک مٹکی ہوتی جس مین دہی بھرا ہوتا تھا اور اس کے منہ پر بھی سوہا ناڑے سے باندھ دیا جاتا تھا اور اس کے گلے مین مبارک فالی کے لئے دو ایک مچھلیان بھی بندھی ہوتی تھین ۔ یہ چیزین دولھن کے گھر جاتین اور وہان تمام رشتہ دارون اور ملنے والون مین تقسیم ہوتی تھین ۔

سانچق کے دوسرے روز ہی شب کو دولھن کے گھر سے ایک بڑے جلوس اور روشنی کے اہتمام کے ساتھ مہندی جاتی تھی ۔ اور جب مہندی والے واپس ہوتے تو دولھا کے لئے دولھن والون کی جانب سے اس کا بھاری جوڑا بھیجا جاتا جس کو پہن کر وہ سسرال جاتا تھا ۔ جوڑے کے ساتھ انگوٹھی یا جس کی جیسی حیثیت ہوتی ۔ سونے کا سہرا یا پھولون اور کرن کا سہرا بنوا لیتے تھے ۔ پسی ہوئی مہندی اور کچھ مٹھائی وغیرہ بھی ہوتی جس کو طباقون مین سجا کر بھیجا جاتا تھا ۔

پھر مہندی کے دوسرے دن برات آتی تھی برات کی شان و شوکت کا اندازہ بخوبی ہم فسانہ آزاد کے اس اقتباس سے لگا سکتے ہین ۔ جس مین ہمایون فرکی شادی کا ذکر ہے ۔

"------اتنے مین ایک مغلانی آئی کہا حضور شاہ چھڑے کی گلی کی طرف سے جو چوک مین میری ڈولی آئی، تو افوہ مین کیا عرض کرون سرکار کھچا کھچ آدمی بھرے ہوئے تھے ڈولی بھلا کہان جا سکے، ہاتھی اور گھوڑے اور اونٹ اور سانڈنی سوار اور باجے کے ٹٹو اور تلنگے اور گورون کا باجا، انگریزی باجا ہندوستانی باجا، شہنائی والے، ڈنکے والے، چوبدار خاص بردار، جھنڈی والے، تامدان میانے ------ حسن آرا ۔ نوشہ کو بھی دیکھا تھا بی مغلانی ۔ ضرور دیکھا ہو گا ۔

مغلانی ۔ جی ہان حضور سینہ تانے ہوئے بانکپن سے گھوڑے پر جمے ہوئے تھے ادھر ادھر چوبدار سونے چاندی کے عصا لیئے ہوئے ساتھ تھے ۔ سنا کہ فقط گھوڑے کے بجنے اور اس کے ساز اور زیور مین کوئی اسّی ہزار روپیہ صرف ہوا --- [1]

---

[1] ۔ فسانہ آزاد ۔ جلد سوم ۔ صفحہ ۵۸۸

اسی طرح میان آزاد کی برات جاتی ہے ۔

" تارون کی چھاؤن مین آزاد کی برات پڑے
کروفر کے ساتھ روانہ اور عازم محل عشرت
منزل جانا نہ ہوئی ۔ جب چوک مین اس عظمت
شاہانہ اور سطوت خسروانہ سے برات آئی تو تماشائیون
نے جو بصد شوق منتظر کھڑے تھے گویا منہ مانگی
مراد پائی ۔
یون سواری جو چوک مین آئی
محو حیرت ہوئے تماشائی "

جب برات دولھن کے دروازے پر پہنچتی تو شہنائی بجتی اور دولھا گھوڑے سے اتر کر گھر مین جاتا وہان اس کی سالیان اور بھاوجین پردہ مین سے خوب مذاق کرتین ۔ دولھن کو اس وقت تک سسرال کا جوڑا نہین پہنایا جاتا تھا ۔ اس کے ہاتھ پر مصری رکھ کر دولھا کو کھلائی جاتی جس کو مراثنین اور سالیان اور بھاوجین پریشان کر کر کے دولھا کے منہ مین جانے دیتی تھین ۔

اس کے بعد دولھا مردانے مین آجاتا اس کے لئے مسند اور تکیہ خاص طور پر لگا ہوتا ۔ سنہری سہرے پر پھولون کا سہرا ڈالے

---

لہ ۔ فسانہ آزاد ۔ جلد چہارم ۔ صفحہ ۴۵۶

دولھا خاموشی سے بیٹھ جاتا تھا ۔ اب عقد ہوتا ۔ اس وقت لڑکی والے کا گواہ اور لڑکے والے کا گواہ دونون موجود ہوتے تھے جو جاکر پردہ کے پیچھے سے دولھن کی مرضی معلوم کرتے ۔ باہر دولھا سے بھی اس کی رضامندی لے لیتے تھے ۔ اس کے بعد قاضی نکاح پڑھاتا تھا ۔ اور بعد مین ایک دعائیہ خطبہ پڑھا جاتا تھا ۔

نکاح کے بعد شربت مٹھائی وغیرہ تقسیم ہوتی تھی ۔ رقص و سرور کی محفلین جمتی تھین ۔ پوری رات جشن منایا جاتا تھا ۔ دوسرے دن رخصت سے پہلے دولھا کو گھر مین بلاتے تھے ۔ اس وقت آرسی مصحف کی رسم ہوتی تھی ۔ یہ رسم اس طرح کی جاتی کہ دولھا دولھن کو برابر بٹھا کر کوئی ڈوپٹہ یا ریشم کی چادر اوپر سے دونون پر ڈال دیتے اور آئینہ درمیان مین رکھ کر قران شریف لا کر دولھا کو دیا جاتا کہ سورہ[1] اخلاص پڑھکر دولھن کے منہ پر پھونک دے یا دولھن کی پیشانی پر دولھا کی انگلی سے سورہ اخلاص لکھوائی جاتی تھی ۔ دونون صورتون مین دلھن کا منہ آئینہ ھی مین دکھایا جاتا تھا ۔ اسی طرح دولھن سے کہتے کہ تم آئینہ مین دولھا کا منہ دیکھ لو ۔ لیکن وہ شرم سے ایسا نہ کرتی تھی ۔ مراثنین دولھا کو اور دولھا کی عزیز عورتون کو اس وقت خوب گالیان دیتی تھین ۔ دولھا سے ایسے جملے کہلواتی تھین جس مین غلامی اور اطاعت کا اقرار ہوتا تھا ۔

---

[1] ۔ کہین پڑھ کر پھونکی جاتی تھی اور کہین پر ماتھے پر لکھواتے تھے ۔ دونون طرح سے ہوتا تھا ۔

اس رسم کے بعد دولھن کا تمام جہیز باھر لا کر رکھ دیتے ۔ جس کی جیسی حیثیت ھوتی اسی کے مطابق جہیز ھوتا ۔ رخصت کے وقت مراثنین بابل کے گیت گاتی تھین جن کو سن کر تمام عورتین اور خود دولھن بری طرح رونے لگتین پھر دلھن فینس پر سوار کی جاتی اور دولھا اپنی سلامی لے کر دولھن کو ساتھ لیے کر اسی شان کے ساتھ جس طرح آیا تھا واپس گھر جاتا ۔ اس وقت سب سے آگے دولھن کی فینس، پھر دولھا کا گھوڑا، پھر مردون کا ھجوم، عورتون کی گاڑیان، پھر جہیز کا سارا ساز وسامان ھوتا تھا جس کو کشتیون مین سجا کر لے جاتے تھے ۔ دولھن کے ساتھ اس کے گھر والے پکا ھوا کھانا بھی کر دیتے تھے ۔ اس کھانے کو بھوڑے کا کھانا کہتے ھین ۔

جب دولھا کے دروازے پر سب لوگ پہنچ جاتے تو بندوق چلتی اور شہنائی بھی بجتی تھی ۔ پھر جس وقت دولھا دولھن کو ھمراہ لے کر صدر دروازے پر آتا تو اس کی بہنین دروازہ روک لیتی تھین اور جس وقت تک نیگ نہ ملتا دروازہ نہین چھوڑتی تھین ۔ اس رسم کو دوار رکائی کہتے ھین ۔ اب نیگ لے کر بہنین الگ ھٹ جاتین اور دولھا دولھن اندر لائے جاتے ۔ دولھن کا سسرال مین سب سے پہلے میٹھا منہ کرایا جاتا ۔ دولھن بے حد شرمائی رھتی ۔ پھر دوسرے دن صبح سویرے اس کے بھائی لینے آ جاتے دولھا بھی اس کے ساتھ جاتا تھا ۔ شام کو پھر دولھن اپنی سسرال واپس آ جاتی تھی ۔

شادی کے چار دن بعد ایک رسم اور ہوتی تھی جس کو چوتھی کہتے تھے اس میں دولھا کے یہاں سے قسم قسم کی ترکاریاں، پھل، مٹھائی دولھن والوں کے گھر آتی تھیں ۔ یہاں پہلے سے بہت سے مہمان جمع ہوتے تھے ۔ اس موقع پر پہلے تو دولھا اور دولھن اُن پھلوں اور ترکاریوں میں سے کوئی چیز ایک دوسرے کے مار مار کر کھیلتے تھے پھر ساری عورتیں ان کی تقلید کرتی تھیں یعنی ایک دوسرے کے ساتھ ان ترکاریوں اور پھلوں سے مذاق کرتی تھیں ۔ ( اس کو چوتھی کھیلنا کہتے ہیں ) اس مذاق میں کبھی کبھی چوٹیں بھی لگ جاتی تھیں ۔ لیکن کوئی برا نہیں مانتا تھا ۔

اس رسم کے بعد چالے وغیرہ ہوتے جن میں دولھا دولھن اور ان کے قریبی عزیزوں کو تمام رشتے دار باری باری اپنے یہاں بلاتے تھے ۔ یہ دعوتیں بڑی دھوم دھام سے ہوتی تھیں ۔

پھر جب کسی کے یہان ولادت ہونے والی ہوتی تھی تو حمل کے ساتوین مہینے اس کی گود بھری جاتی تھی اس رسم کا ذکر فسانہ آزاد مین اس طرح ہے ۔

" ساتوین مہینہ گود بھری گئی ۔ لال رنگا
ہوا ڈوپٹہ اور سبز ریشمی پاجامہ پہنایا
سوکھے کپڑے مین میوے اور ترکاریان کھوپرا
اور ناریل باندھ کے بڑی جٹھانی نے حسن آرا
کی گود مین پوٹلی دی ۔ حسن آرا نے
کھڑے ہو کر پیر پیمبرون کو سلام کیا بعد
آذان بڑی بوڑھیون کو بندگی کی ۔ جب

دولھن سلام کر چکی تو پھولون کا گہنا
پہنایا گیا آئینے پر زرد رنگا کپڑا رکھا
اور دودھ سے دیکھا کہ بیٹا ہو گا یا
بیٹی "۔

اس کے بعد جب بچّہ پیدا ہو جاتا تو چھٹی کی رسم ہوتی تھی ۔

---

ـــہ ۔ فسانہ آزاد ۔ جلد چار

## چھٹی کی رسم ۔

زچگی کے بعد ماں اور بچے کو نہلایا جاتا تھا ۔ اس دن بڑی دھوم دھام رہتی ۔ یہ تقریب چھ دن بعد یا کچھ زیادہ دنوں بعد کی جاتی تھی ۔ تمام رشتہ کی اور ملنے والی عورتیں جمع ہوتی تھیں ۔ کھانے وغیرہ کا حسب حیثیت انتظام ہوتا تھا ۔ پہلے ماں کو نہلایا جاتا تھا پھر بچہ کو اور بعد میں قریبی عورتیں نہاتیں[1] ۔ نہانے سے پہلے زچہ کے سر میں سات سہاگنیں تھوڑا تھوڑا دودھ ڈالتی تھیں ۔ چھٹی نہلانے کے لئے دن کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ۔ پیر ۔ منگل یا بدھ ان تین دنوں میں سے کوئی ایک دن رکھتے تھے ۔ زچہ جب نہا کر اٹھتی تھی تو خالی گود چوکی سے نہیں اترتی تھی بلکہ بچہ کو گود میں لے کر اترتی تھی ۔ اس وقت اس کی ناک میں نتھ اور تمام دوسرے زیور پہنا دیتے تھے ۔ فسانہ آزاد میں ہے کہ

"چھٹی کے دن ڈومنیاں آئیں ۔ اندر باہر خوشیاں منائیں ۔ زچہ کو گرم پانی سے نہلایا چوکی بچھی ۔ دو پان رکھے گئے ۔ زچہ

---

[1] ۔ یہ ایک اچھا شگن سمجھا جاتا تھا ۔ کہیں دولھا کی بہنیں زچہ کے سر میں دودھ ڈالتی تھیں ۔ اور جس برتن میں دودھ ہوتا تھا اس میں اپنا نیگ ڈلواتی تھیں ۔

کے پاؤن کے نیچے اشرفیان رکھین ۔ چوک بھرا گیا ناک مین نتھ
پہنائی ۔ زچہ کی گود مین بچہ دیا ۔ گہنا پہنایا ۔ افشان چنی گئی "

دولھن کے میکے سے اس دن چھوچھک[1] آتی تھی ۔ یہ عام طور سے باجے گاجے کے ساتھ آتی تھی ۔ دلھن والے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق مان اور بچے کے لئے زیور اور دولھا کے خاندان والون کے لئے جوڑے، چاول، دال اور میوہ بھیجتے تھے ۔ بچّے کے لئے خاص طور سے خوبصورت کھلونے اور استعمال کی دوسری چیزین جیسے پوتڑے دوھرین سوزنیان کشتیون مین سجی ہوئی آتی تھین ۔ امیرون کے یہان سے کچھ چاندی کے چاول اور کچھ سونے کی دال بنی ہوئی ساتھ مین آتی اس کے علاوہ امیر لوگ سونے کی ہنسلی کڑے اور عقیقے کے بکرے بھی بھیجتے ۔ بکرون پر گوٹے کناری کی جھولین پڑی ہوئی ہوتین مونگ اور چاولون کی بوریان اور میوے کی بوریان وغیرہ بھی ساتھ ہوتین ۔ اس دن مامون کی طرف سے ہنسلی کڑے اور خالہ کی جانب سے کرتے بھیجے جاتے ۔ دوسرے قریبی عزیز بھی کچھ نہ کچھ نقدی کی شکل مین یا تحفہ کی شکل مین دیتے تھے ۔

مراثنین خوب گانے گاتی تھین ۔ زچہ گیریان ہوتی تھین اسی رات کو زچہ اور بچہ کو سجا کر دالان مین چوکی بچھا کر بٹھا دیتے تھے ۔ ان دونون کے سرون پر سموسے دار ٹوپی باندھتے تھے ۔ پھر

---

[1] ۔ چھوچھک ۔ دولھن کے میکے سے جو سامان آتا تھا اسکو کہتے ہین ۔

[2] ۔ زچہ گیری ۔ وہ گانے جس مین زچہ بچہ کی تعریف اور خاندان والون کا ذکر ہوتا تھا ۔

زچہ بچہ کو باہر چوکی پر کھڑا کر کے تارے دکھائے جاتے ۔

" سر شام زچہ اور بچون کے سہرا باندھا اور تارے دکھانے چلے ۔ صحن مین ایک چوکی بچھی تھی زچہ کی گود مین سموچا ناریل اور ترکاریان دین حسن آرا نے سات تارے گنے ۔ چارون طرف کھیلین پھینکین ۔ چارون کونون کو سلام کیا جب حسن آرا کمرے مین ائین ۔ دولھا نے جو پلنگ پر متمکن تھے دولھن کو بیٹھنے نہین دیا ۔ سالیون سالیون سے بھرپور حق لیا ۔ اس کے بعد آزاد پلنگ پر دولھن کے پاس بیٹھے تو حسن آرا نے گود مین بچون کو دیا ۔ تمام شب جلسہ رہا "۔

اسی طرح کے اور دوسرے نہان ہوتے تھے ۔ لیکن ایسی رونق نہین ہوتی تھی مگر چالیس روز کے بعد جو غسل ہوتا اس مین پھر اسی طرح کا جشن منایا جاتا تھا ۔ اس غسل کو چھلا نہانا بھی کہتے تھے ۔

---

فسانہ آزاد ۔ جلد چہارم ۔ صـــ ۵۰۰ـــہ

عقیقہ ۔ بچّہ کی پیدائش کے ساتوین[1] دن اس کے سر کے بال اتروائے جاتے تھے اور بچّہ کو باہر لاکر سامنے قران رکھا جاتا تھا پھر جو آیت بھی سامنے آ جاتی اس حرفون کو ملا کر نام رکھا جاتا تھا ۔ کوئی شخص تاریخی نام نکالتا تھا یا پھر دادا' دادی وغیرہ کے نام پر کوئی نام رکھتا تھا ۔ نام تجویز کرنے کے بعد نائی کو چاندی کا اسّترا' نہرنی' کٹوری لنگی' وغیرہ دی جاتی تھی ۔ بال پہلے خوب بھگو لئے جاتے اُس کے بعد نائی اسّترا لگاتا ۔ ادھر نائی سر پر استرا چلاتا ادھر قصائی بچہ کا نام لے کر اور اللّٰہ اکبر کہہ کر بکرے کی گردن پر چھری چلاتا ۔[2] لڑکی ہوتی تو ایک بکری اور اگر لڑکا ہوتا تھا تو اس کے نام کے دو بکرے ہوتے تھے ۔ یہ ایک طرح سے بچّہ کا صدقہ ہوتا ہے ۔ اس گوشت کو نانی' نانا' دادی' دادا نہین کھاتے تھے ۔ دوسرے عزیز وغیرہ کھا سکتے تھے ۔ بکرے یا بکری کی ایک ران دائی کو دے دی جاتی تھی ۔ سر کے اتّرے ہوئے بالون کو چاندی یا سونے مین تول کر دھوبن کو دے دیا جاتا تھا کہ وہ جاکر بالون کو دریا مین ڈال دے اور چاندی سونا جو بھی ہوتا اس کو خود لے لے ۔ یا پھر اس سونے چاندی کو بھی نائی ہی کو دے دیتے تھے ( اگر ساتوین دن عقیقہ نہ ہوا ہو تو زندگی مین کبھی بھی کیا جا سکتا ہے )

اس کے بعد سارے عزیز و احباب بچّے کو نقدی کی صورت مین کچھ نہ کچھ دیتے ۔ دعوت ہوتی ۔ خوب گانے بجانے کی محفل جمتی ۔ مراثنین ناچتین گاتین اور اپنے نیگ لیتی تھین ۔

---

[1] ۔ کہین ساتوین دن اور کہین اٹھوین دن کا ذکر ملتا ہے ۔ "گزشتہ لکھنؤ" مین اٹھوین دن کا اور "رسوم دھلی" مین ساتوین دن کا ذکر ملتا ہے ۔

## ختنہ ۔

یہ مسلمانوں کی ایک شرعی رسم یعنی سنت ہے۔ بعض گھروں میں چھٹی کے دن اور بعض میں دس یا بارہ برس کی عمر میں کراتے تھے ۔ اور بعض جگہ بچہ کے پیدا ہوتے ہی کرا دیتے تھے ۔ تاکہ چھٹی کے دن تک بچہ نہائے تو ٹھیک ہو جائے ۔

ختنہ سے ایک دن پہلے نائی سب ملنے والے گھروں میں سنّتوں کا بلاوا دے آتا تھا ۔ پھر دوسرے دن سہ پہر کو نائی آتا شیرینی وغیرہ اُس کے آنے سے پہلے ہی خوانوں میں سجا کر رکھ دی جاتی ۔ کچھ گھروں میں لوگ بچہ کو ختنہ کرانے سے پہلے بھنگ یا کوئی دوسری نشہ کی چیز کھلا دیتے تاکہ تکلیف کا احساس نہ ہو ۔

اب لوگ آنا شروع ہو جاتے تھے اور جو فرش پہلے ہی سے بچھا ہوتا اس پر آ آ کر بیٹھنا شروع ہو جاتے تھے ۔ ان لوگوں کے سامنے پان، الائچی، حقّہ پیش کیا جاتا ۔ جب زیادہ تر مہمان آ چکتے تو نائی اپنا سامان نکالتا اور ایک آدمی بچہ کو گود میں لے کر بیٹھتا نائی بچے کو پھلاتا جاتا اور اپنا کام کرتا جاتا تھا ۔ ختنہ سے فارغ ہو کے بعد نائی اپنی کٹوری رکھتا جس میں تمام رشتہ دار اور ملنے والے مرد ایک ایک دو دو روپیہ ڈال دیتے تھے ۔ یہ پیسے نائی کے ہوتے اور اس کے علاوہ بھی اس کو گھر سے بھی اس کام کا روپیہ ملتا تھا ۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد کھانا وغیرہ کھلاتے رات میں محفل رقص و سرور ہوتی ۔ اور اس کے کچھ دن بعد جب بچّہ اچھا ہو جاتا تو پھر لوگ جمع کئے جاتے تھے ۔ بچّہ کو نہلا کر نئے کپڑے پہنائے جاتے اور دولھا بنایا جاتا ۔ نانی کے گھر سے بچّہ کا جوڑا آتا تھا ۔ پھر اسے گھوڑی پر چڑھا کر کسی بزرگ[1] کے مزار پر لے جاتے تھے ۔ گھوڑی کے ساتھ پورا جلوس اور باجا وغیرہ ہوتا تھا ۔ بزرگ کے مزار پر بچّہ سے سلام کروا کے واپس لے آتے تھے گھر آکر لوگوں کی دعوت کی جاتی گانے بجانے کا انتظام ہوتا ۔ گھر میں عورتیں سہاگ[2] گھوڑیاں گاتی تھیں ۔ اسی طرح خوب رونق رہتی تھی ۔

---

[1] ۔ کسی بزرگ کے مزار کے علاوہ کہیں مسجد میں بھی لے جاکر سلام کراتے تھے ۔ ختنہ تو سنّت ہے باقی باتیں رسمیں تھیں ۔

[2] ۔ وہ گانے جس میں گھوڑی کی تعریف اور بچہ کی تعریف ہوتی ہے ۔ یہی گیت شادی کے موقعہ پر بھی گاتے ہیں ۔

## دودھ بڑھائی ۔

دودھ بڑھائی سے مطلب ہے بچّہ کا دودھ چھڑانا[1] زیادہ سے زیادہ سوا دو برس کے بعد ورنہ اس سے پہلے دودھ چھڑوا دیا جاتا ہے ۔

اس دن بھی خوب دھوم دھام ہوتی تھی ۔ اس دن خاص طور پر کھجوریں[2] پکائی جاتی تھیں ۔ ننھیال اور ددھیال کے لوگ اور ان کے علاوہ دوسرے اعزا جمع ہوتے تھے ۔ ایک برتن میں کھجوریں بھر کر بچّے کے سامنے رکھتے تھے اگر بچہ نے ہاتھ بڑھا کر صرف ایک کھجور ہاتھ میں لے لی تو خوش ہو کر سب کہتے کہ بچّہ ہمارا بس ایک دن ضد کرے گا ۔ یعنی دودھ کی ۔ اور اگر دو تین ہاتھ میں بھر لیں تو کہتے کہ یہ تو بڑا ضدی معلوم ہوتا ہے کئی دن ضد کرے گا اور پریشان کرے گا ۔

اس رسم کو ویسے تو دودھ چھڑانا کہنا چاہئے تھا لیکن چھڑانا وہم کی وجہ سے نہیں کہتے تھے بلکہ بڑھانا نیک فال سمجھ کر بولتے تھے انا کو بھاری بھاری جوڑے اور دودھ چھٹائی کے روپے دیئے

---

[1] ۔ یہ مدت شرعی ہے ۔

[2] ۔ آٹا گھی اور شکر میوہ کو ملا کر گھی میں تلتے ہیں ۔

جاتے تھے ۔ اور گھر کے ملازمین کو انعام ملتا تھا ۔ مان یا انا دودھ سے نفرت پیدا کرنے کے لئے طرح طرح کی ترکیبیں کرتی تھیں تاکہ بچہ ڈر جائے یا اسے مان کے دودھ سے نفرت پیدا ہو جائے اور پھر جب بھوک لگے تو اور کی دوسری چیزیں کھانا شروع کر دے ۔

اس موقع پر بھی جس کی جیسی حیثیت ہوتی اس کے مطابق وہ کھانا وغیرہ کرتا ۔ مراثنیں ڈھول بجاتیں اور گانے گاتی تھیں ۔

## کھیر[1] چٹائی ۔

یہ رسم اس دن ہوتی تھی جب بچہ چار پانچ سال کا ہو جاتا تھا اور دوسری چیزین کھانے لگتا تھا ۔ اکثر گھرون مین اس کا آغاز کھیر سے ہوتا تھا ۔ اس دن کھیر خاص اہتمام سے پکائی جاتی ۔ تمام رشتہ کی عورتین مل کر کھیر پکانے کی تیاری کرتی تھین یہ کھیر سب سے پہلے بچہ کو کھلائی جاتی تھی ۔ بچے کو نئے کپڑے پہنائے جاتے جب بچہ کھیر کھا لیتا تو اس کو نقدی ملتی اور خوش نصیبی اور درازئی عمر کی دعائین دی جاتی تھین ۔

پورے دن خوب رونق رہتی اور رقص و سرور کی محفل ہوتی لکھنؤ والے تو ہر حال مین اس کے منتظر رہتے ہی تھے ۔

---

[1] ۔ یہ بھی ایک طرح کی مٹھائی ہوتی تھی ۔ دودھ شکر میوہ ملا کر بنائی جاتی ۔ اس کو گھر مین ہی عورتین بنا لیتی تھین ۔

## بسم اللّٰہ ۔

جب بچّہ ساڑھے چار سال کا ہو جاتا تو اس کو بسم اللّٰہ پڑھا کر مدرسہ جانے کے لئے تیار کیا جاتا ۔

عامّ طور سے جب بچّہ کی عمر چار سال، چار ماہ، چار دن، ہو جاتی تو یہ رسم ادا کی جاتی تھی ۔ اس چار کے عدد نے اس تقریب میں یہ خصوصیت پیدا کرلی تھی کہ چارسال، چار ماہ، چار دن، کےساتھ چار منٹ، کا بھی لحاظ رکھا جاتا تھا ۔

اس دن لڑکی ہو چاہے لڑکا ہاتھوں میں مہندی لگائی جاتی پھر اسے نیا جوڑا اور نئی ٹوپی پہناتے ۔ عصر کے وقت اسے دولھا یا دولھن بناکر باہر لاتے تھے ۔ خوانوں میں شیرینی سجا کر رکھ دی جاتی تھی ۔ بچہ کو ایک خوبصورت چوکی پر لا کر بٹھاتے پھر کوئی مولوی یا گھر کا بزرگ بچے کو پڑھانے کے لئے بیٹھتا تھا اور پہلے بسم اللّٰہ پھر قران کی سورت " اقرا باسم ربک الذی خلقا " پڑھوائی جاتی تھی ۔ اس رسم کا حقیقی مقصد گویا یہ دعا کرنا تھا کہ ۔

" خدا ہر دشواری کو اسان کرے اور خیریت سے تعلیم ختم ہو "

---

لہ ۔ ساڑھے چار سال " رسوم دھلی " میں ہے ۔ اور دوسری کتابوں وغیرہ میں چار سال ۔ چار ماہ ۔ چار دن ملتا ہے ۔ اور صحیح بھی چار سال ۔ چار ماہ ۔ چار دن ہے ۔

اس کے بعد الف ۔ ب پڑھواتے تھے ۔ اس کے بعد سب لوگ خوشی سے تالیاں بجاتے تھے ۔ اور مٹھائی تقسیم ہوتی تھی ۔ بچے کو نقدی یا تحفے دیئے جاتے تھے ۔ اگر کوئی صاحب حیثیت ہوتا تو کھانا وغیرہ بھی ہوتا تھا اور شاعرہ یا رقص کی محفل بھی ہوتی تھی ۔

## روزہ کشائی ۔

ان تمام رسومات کے علاوہ ایک رسم روزہ کشائی کی بھی ہوتی تھی ۔ جب بچّہ بڑا ہو جاتا تھا تو اس کو روزہ رکھواتے تھے ۔ اس دن اس کے لئے نئے کپڑے بنائے جاتے ۔ تمام لوگوں کو گھر پر بلایا جاتا تاکہ بچے کے ساتھ شام کو افطار کریں طرح طرح افطاری کافی مقدار میں تیار کی جاتی تھی ۔

شام کو سب مل کر بچے کو ہار پھول پہناتے تھے ۔ اور خوشی میں انعامات بھی دیتے تھے ۔ اس دن رمضان المبارک کے احترام کے خیال سے رقص و سرور کی محفل نہیں ہوتی تھی ۔

---

گزشتہ لکھنؤ ۔ عبدالحلیم شرر ۔

غمی کی رسوم ۔

جس طرح خوشی کی رسوم ہوتی تھین اسی طرح غمی کی بھی رسمین ہوتی تھین ۔ اگر کسی کے یہان کوئی مر جاتا تو سارے خاندان کے اور دوسرے ملنے والون کو اطلاع کر دی جاتی تھی ۔ مرنے والے کے گھر مین تین دن چولہا نہین جلتا تھا ۔ بلکہ قریبی عزیزون کے یہان سے کھانا تیار ہو کر آتا اور سب لوگ مل کر کھاتے تھے ۔ بہت سی جگہون پر مرنے والے کے گھر تین دن تک عزیز مرد عورتین سوتے بھی تھے ۔

تیسرے دن صبح قران خوانی ہوتی اور جنے[1] پڑھے جاتے اور گھر مین چولہا جلتا تھا ۔ اور شام مین بہت سا کھانا پکا کر اس پر فاتحہ پڑھی جاتی تھی اس کے بعد اس کھانے کو غریبون مین تقسیم کر دیا جاتا تھا ۔ قریبی عزیزون اور دوستون کو بھی روک کر کھانا کھلایا جاتا تھا ۔ اس دن صبح سے شام تک برابر مہمان آتے جاتے رہتے تھے ۔

عورتین گھر مین حلوہ بناتی تھین اور اس پر نیاز دلواتی تھین ۔ فسانہ آزاد مین ہمایون فر کے سوم کا بیان اس طرح سے کیا گیا ہے ۔

---

[1] ۔ جنون پر کلمہ پڑھا جاتا تھا ۔

" سوم کے روز ہزارون آدمی جمع تھے ۔ خلقت ٹوٹ پڑی ۔ اس کے کئی سبب تھے ۔ ایک یہ کہ شہزادہ کا سوم تھا دوسرے مجاور کی تقریر اور قلعہ معلیٰ والون کی شہادت نے لوگون کے دلون پر عجب رنگ اثر جما یا تھا ۔ آٹھ بجے کے قبل اس قدر آدمی جمع ہوئے کہ گو مرزا ہمایون فر کا محل' کیوان نشان بدرجہ غایت رفیع الشان و عظمت تو امان تھا' تاہم اس مین اس قدر گنجائش نہ تھی کہ سب شرکائے مجلس سوم بیٹھ سکتے ۔ لہذا فوراً تمگیرے اور خیمے نصب کئے گئے ۔ فرش دو گھڑی رات ہی سے بچھا تھا ۔ اور صندوقون مین سیپارے رکھے تھے ۔ جب جب سب روساء امراء و عمائدین شہزادے اور احباب اور اعزہ و اقربا جمع ہو گئے' قاریون نے قران خوانی شروع کی جو لوگ پڑھ سکتے تھے' ان مین اکثر کے ہاتھ مین سیپارے تھے ۔ بعد قران خوانی بارہ امام پڑھے گئے ۔ بعد ازان اعزہ نے دوہے بیلے چنبیلی کے پھول اٹھائے ۔ ایک پیالے مین صندل اور خوشبودار تیل تھا ۔ اس مین نے دو دو چار چار پھول ڈالے۔ مرثیہ خوانون نے مرثیہ پڑھے "۔ [1]

---

[1] ۔ فسانہ آزاد ۔ جلد سوم ۔ صفحہ ۶۴۹

## چہلم یا چالیسوان ۔

جب میت کو دفنائے ہوئے تقریبا چالیس روز ہو جاتے تھے تو چالیسوین کی رسم ادا کی جاتی تھی ۔ لیکن اس کے لئے یہ ضروری نہین تھا کہ پورے چالیس روز ہی کے بعد کرایا جائے ۔ بلکہ اس مین چار پانچ روز کم ہی کر دیئے جاتے تھے ۔ اس دن غریبون کو کھانا دیا جاتا اور کسی مسکین کو جوڑا' مسواک' کٹورا' رکابی' پتیلی' کنگیر' جا نماز' وغیرہ دی جاتی۔ اگر عورت ہوتی تو زنانہ جوڑا ۔ زنانی جوتی ۔ کنگھی ۔ مسّی ۔ سرمہ ۔ عطر وغیرہ زیادہ کر دیتے تھے ۔ اس کے پیچھے یہ خیال کام کرتا تھا کہ یہ چیزین مردے کو مل جائین گی ۔

اس دن اس قدر کھانا پکایا جاتا کہ پورے کنبے کے لوگ اور غریب سب ہی کھاتے تھے ۔ اس دن سے سوگ اتر جاتا تھا ۔ لیکن دیہاتون مین ایک سال تک سوگ منایا جاتا تھا ۔ اس عرصے مین وہ کسی بھی خوشی کی تقریب مین شرکت نہین کرتے تھے ۔ اسی طرح سہ ماہی چھماہی اور برسی کی فاتحہ زور و شور سے کی جاتی ۔ جوڑے وغیرہ خیرات کرتے تھے ۔

# " باب پنجم "

## صنعت و حرفت

## صنعت و حرفت ۔

تمام چیزون پر نظر ڈالنے کے بعد اب همین یہ دیکھنا هے کہ ایا لکھنئو والے دن رات صرف تفریحی مشاغل مین هی مصروف رهتے تھے یا کوئی کام کی بات بھی اُن کے دماغ مین آتی تھی ۔ مطالعہ سے پتہ چلتا هے کہ ان کی نظر زندگی کی دوسری ضروریات پر بھی تھی ۔ آرائش کی چیزین بھی اس عہد کی ترقی یافتہ صناعی کا پتہ دیتی هین ۔ چونکہ زمانہ کا مزاج نفاست اور نزاکت کے سانچے مین ڈھل رہا تھا اور زندگی نئی کروٹین لے رهی تھی اس لئے اختراعات اور ایجادات کا ایک نیا باب کھل گیا ۔ لباس پر خاص توجہ کی گئی اور اس بات کا خیال رکھا گیا کہ لباس ایک طرف دیدہ زیب هو اور دوسری طرف موسمی تقاضون کے مطابق هو ۔ نئے مذاق کے مطابق پوشاک کی وضع و قطع مین چابک دستی کے ساتھ حسین تبدیلیان کی گئین ۔

ممکن ہے کہ پوشیش اور آرائش کا یہ سامان تجارتی نقطہ نظر سے زیادہ نفع بخش نہ رہا ہو اور اودھ کے باہر اس کی مانگ نہ رہی ہو مگر یہ ظاہر ہے کہ اہل لکھنؤ کسب معاش غافل نہ تھے نیز یہ کہ وہ صرف خرچ کرنا ہی نہیں جانتے تھے کمانا بھی جانتے تھے ۔ اپنے اس خیال کی تائید میں ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ لکھنؤ کی ان چند مصنوعات کا ذکر کریں جو خواص اور عوام دونوں میں مقبول تھیں ۔

کپڑوں کے لحاظ سے لکھنؤ کی سب سے زیادہ شہرت چکن ۔ کامدانی ۔ کار چوب کے سلسلہ میں ہوئی ۔ یہ مال نہ صرف لکھنؤ ہی میں پسند کیا جاتا بلکہ باہر دور دور تک اس کی مانگ تھی جس کی تیاری میں عورت اور مرد سب حصے لیتے تھے ۔ عورتوں کے لئے مخصوص صنعت لچکا

پٹھا ۔ چٹکی وغیرہ تھی جس کی آمدنی سے ان کی زندگی خوش حالی سے بسر ہوتی تھی ۔ چرخہ سے جو سوت تیار ہوتا اس سے پلنگ پوش سوسی کے تھان وغیرہ بنتے ۔ تار کشی کا کام یہاں اس پیمانہ پر ہوتا تھا کہ ہندوستان کا کوئی دوسرا شہر اس لحاظ سے لکھنؤ کا ہم پلہ نہ سمجھا جاتا ۔ یہ صنعت اپنی ہمہ گیری کی وجہ سے عام ہو گئی تھی جس کے بنانے میں سیکڑوں خاندان مشغول رہتے ۔ مخملی ٹوپی گرگابی اور کم خواب کے جوتے بیشتر لکھنؤ میں بنتے تھے یہ لکھنؤ کے کاریگروں کا ریاض ہی تھا جس کی بدولت یہ چیزیں ایسی مقبولیت پا گئیں کپڑوں اور جوتوں کی صناعی کے فروغ کا ایک سبب ان کے نقش و نگار تھے لکڑی کے ٹھپوں سے نہایت خوبصورت پھول کپڑوں اور جوتوں پر بنائے جاتے تھے ۔ ایک مختصر زمانہ ہی میں ایسے ایسے رنگ ریز اور دست کار پیدا ہو گئے جو اپنے فن میں آپ ہی اپنا جواب تھے ۔

صنعت حرفت کا فروغ دیکھ کر دور دراز کے شال بننے والے بھی بڑی تعداد میں کشمیر اور دوسری جگہوں سے لکھنؤ آ گئے ۔ اور ان کو کافی شہرت حاصل ہوئی ۔ ان شالوں پر تار کشی اور سونے چاندی کے تاروں سے بیل بوٹے بنائے جاتے تھے ۔ سونے اور چاندی کے تاروں کے ساتھ موتیوں کا بھی استعمال کرتے تھے ۔ تارکشی سے ایسے رنگ برنگ پھول بناتے تھے کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی ۔

شال بنانے والون کے علاوہ لکھنئو کے رفوگر بھی بہت مشہور تھے ۔ یہ لوگ اتنا عمدہ رفو کرتے تھے کہ کپڑے کو دیکھ کر کوئی شخص بھی یہ نہین پہچان سکتا تھا کہ اس مین رفو کیا گیا ھے ۔

ظروف ۔

یون تو[1] برتنون کے بنانے کا سلسلہ یہان عہد قدیم سے جاری تھا ۔ لیکن جب دھلی کی سلطنت برائے نام رہ گئی اور انتشار و کس‌مپرسی نے اھلِ علم اور شعراء کی طرح کمھارون اور کس گرون کو بھی لکھنئو کی پرسکون فضا مین سانس لینے پر مجبور کیا تو ظروف سازی مین نمایان ترقی ھوئی اتفاق سے لکھنئو کی مٹی ظروف کے لئے نہایت موزون ثابت ھوئی قدر دانی اور جدت پسندی بھی اس صنعت کے سازگار ثابت ھوئی ۔ دھلی کے نمونون پر جلا کی گئی ۔ طرح طرح سے ان کو خوبصورت و سبک بنانے کی فکر ھوئی ۔ کمھارون اور کس گرون نے بھی ذھانت کا ثبوت دیا ۔ اودھ کے حکمرانون کے زمانے مین مٹی کے برتنون مین صراحی، آب خورہ، چلم فرشی اور ھانڈی پر خاص توجہ کی گئی پہلے جو بھدا پن ان برتنون مین ھوتا تھا اس کو دور کر کے انھین سبک اور رنگین بنایا گیا ۔ رنگ اور نقش نگار اور ساخت کی بدولت یہ ھمیشہ سے زیادہ دیدہ زیب ھو گئے ۔ عوام و خواص مین ان کی خریداری بہت بڑھ گئی ۔ کیونکہ یہ ضرورت اور آرائش دونون کے لئے کارامد ثابت ھوئے ۔

---

[1] ۔ اردو شاعری کا سماجی پس منظر ۔ ص ۲۷۷

آبخورے -

آبخورے پانی پینے کے ظروف تھے - شیشہ اور نام چینی کے سبک اور خوشنما گلاس اور کٹورے بھی کثرت سے رائج تھے - لیکن گرمیون کے موسم مین ان آبخورون مین پانی بہت ٹھنڈا رہتا تھا اور ان کی ٹھنڈک ہاتھ اور ہونٹون کو ایسی فرحت دیتی تھی جو کسی دوسرے برتن سے نہین ملتی تھی - ان آبخورون سے مٹی کی ایسی سوندھی خوشبو آتی تھی کہ لوگون کا ذہن اس طرف رجوع ہوا کہ مٹی کا عطر تیار کیا جائے چنانچہ مٹی کا عطر تیار ہونے لگا - یہ آبخورے رفتہ رفتہ اتنے سبک اور صاف بننے لگے کہ ان کو کاغذی آبخورے کہا جانے لگا - ان کی باریکی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ شیشون کے گلاسون کو بھی مات کرتے تھے - پھر ان پر نقش و نگار بناکر بالو کی ایک تہ چڑھا دی جاتی تھی کہ پانی کو اور بھی زیادہ ٹھنڈا رکھے -

صراحیان -

آبخورون کے بعد پانی رکھنے کی صراحیان ہوتی تھین - ان کا پیٹ گول ہوتا تھا - اور گردن اوپر کی طرف کو لمبی ہوتی چلی جاتی تھی - ان صراحیون کا رواج تو ایران اور مصر قدیم مین بھی تھا - لیکن لکھنؤ کی صراحیون سے ان کا کوئی مقابلہ نہین کیا جا سکتا - کیونکہ یہ مٹی کی خوبی اور کاریگرون کی لطافت مذاق

کی بدولت نفیس کاغذی اور سبک ہو گئی تھین ۔ ان کے دھانے پر جو متناسب خمیدگی پیدا ہو گئی تھی وہ چیز کہین دوسری جگہ نظر نہین آتی تھی ۔ صراحیون کے علاوہ جھجریان بھی ویسی ہی نازک اور سبک بننے لگی تھین ۔ ان کا پیٹ بھی صراحی جیسا ہوتا تھا ۔ لیکن گردن صراحی سے مختلف ہوتی تھی ۔

## حقّے ۔

حقّون کی مٹی کا اس لئے بنایا جانے لگا کہ دھوان جو نکلے وہ ٹھنڈا اور سوندھا ہو ۔ آبخورون کی طرح مٹی کے کاغذی حقّے بنائے گئے ۔ یہان کے حقّے ایسے نفیس اور خوش قطع معلوم ہوتے تھے کہ ہر جگہ ان کی مانگ ہونے لگی ۔ حقّون مین ایک چھوٹا حقّہ ہوتا تھا جس کو عورتین استعمال کرتی تھین ۔ اور ایک بڑا حقّہ جو دربار اور مردانی محفلون مین رکھا رہتا تھا ۔ ان حقّون کے اوپر خوبصورت بیل بوٹے بنائے جاتے تاکہ دیکھنے مین بھلے معلوم ہون ۔

عظیم اللہ[1] خان نے حقّون مین ایسی خوشنمائی اور نفاست پیدا کی کہ وہ یادگار ہو گئے ۔

---

[1] ۔ اس زمانے مین بہت اچھے حقّے بنایا کرتے تھے ۔

## ھانڈیان ۔

یون تو مٹی کی ھانڈیان ھر جگہ بنتی تھین ۔
لیکن لکھنؤ کی ھانڈیان تانبے پیتل کی پتلیون کی جیسی سچی نقل ھوتی تھین
ویسی کہین اور نہین ھوتی تھین ۔

ان مین ایک ھانڈی جس مین کھیر وغیرہ تقسیم کی
جاتی تھی بڑی خوبصورت اور رنگین ھوتی تھی ۔ یہ صراحیون اور آبخورون کی
طرح کاغذی ھوتین تھین ۔ اور گلابی ھانڈی کہلاتی تھین ۔

کچھ رئیس ان کے اندر گلوریان بھی رکھتے تھے ۔
کیونکہ گرمیون کے موسم مین خاصدان گرم ھو جاتے تھے ۔ تو پانون کو انہی
ھانڈیون مین رکھ دیتے تھے ۔ ان کے رکھنے کے بعد جو خوشبو پانون مین
پیدا ھو جاتی تھی وہ نہایت ھی فرحت بخش ھوتی تھی ۔

## کھلونے اور مورتیان ۔

مگر برتنون سے بھی زیادہ کمال کمھارون نے
کھلونون اور مٹی کی مورتیون مین دکھایا ۔ مٹی کے کھلونون مین اعضا کا تناسب
قائم رکھنے اور فطرت کی سچّی نقل اتارنے مین جو کاریگری یہان کے ان پڑھ
جاھل کمھارون نے دکھائی وہ یونان کے کمال سے کسی طرح کم نہین ۔ وہ
انسان کو دیکھ کر اس کی پوری مورت اتنی ھی بڑی جتناکہ اس کا جسم اور قد ھوتا
تیار کر دیتے تھے ۔ اسی طرح چھوٹی مورتون مین ھر وضع اور ھر طبقے کے

لوگون کی تصویر آتار کر رکھ دیتے تھے ۔

دیوالی مین کثرت سے لوگ ان کھلونون کو خریدتے تھے ۔ اس تہوار پر پہان کے کمھار اپنے فن مین اور نئی نئی ایجادین اور نازک خیالیان دکھایا کرتے تھے ۔

ان کھلونون مین طرح طرح کے گروپ اور سٹ بھی ہوتے تھے ۔ مثلاً انگریزی بینڈ ۔ رنڈیون اور بھانڈون کے طائفے ۔ قدیم نوابون کی محفل ۔ امراء کے دربار مختلف اہل حرفہ کے مجمعے وغیرہ وغیرہ ۔ ہزارون کمھارون کی پرورش کا ذریعہ معاش یہی کھلونے تھے ۔

محرم -

صنعت کو فروغ دینے میں علاوہ ذوق و ضرورت کے ایک مذہبی جذبہ بھی کارفرما تھا اس کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے کہ اودھ کے حکمرانوں کی وجہ سے محرم اس اہتمام کے ساتھ منایا جاتا تھا کہ اس سے پہلے شمالی ہند میں اس کی نظیر نہیں ملتی - واقعہ کربلا کی یاد میں مجلس و ماتم کے سلسلے نے امام باڑوں کو آراستہ کرنا سکھا دیا اس آراستگی نے پنجوں، پٹکوں اور تعزیوں کو نئی شان سے پیش کرنے کے لئے نظر ثانی پر مائل کیا اور طرح طرح کے زرنگار پٹکے - پنجے - حسین تعزیئے بنائے جانے اور پرچم تیار کئے جانے لگے -

علم کے پنجوں کو تراش خراش سے سڈول کیا گیا - سونے، چاندی، تانبے، پیتل کے ٹکڑوں پر کبھی آیات قرانی کبھی اسماء بزرگان دین اس انداز سے لکھے گئے کہ صناعی حسین سے حسین تر ہو گئی - تعزیوں کی ساخت اور سجاوٹ میں طرح طرح کی جدت پیدا کی گئی - یہ تعزیئے اتنے مشہور ہو گئے تھے کہ دور دراز سے لوگ آتے اور اپنی پسند کے انتخاب کر کے اپنے ساتھ لے جاتے - ان چیزوں کی توقی نے لوگوں کو ذریعہ معاش مہیا کرنے میں خاطر خواہ مدد کی - ہزاروں کاریگر ان چیزوں کو بنانے میں سال بھر لگے رہتے[1] چونکہ اس کام میں مذہب کی بھی چاشنی محسوس ہوتی تھی

---

[1] - اردو شاعری کا سماجی پس منظر -

اس لئے دماغ سوزی و دیدہ ریزی بھی گران نہ گزرتی بلکہ یہ خیال ہوتا کہ دنیا میں اس کار خیر سے پیسے ملیں گے اور آخرت میں جنّت ۔ پس اسی جذبہ نے انھیں پنجے اور تعزیئے وغیرہ کی ساخت میں اور بھی جی لگا کر محنت کرنے کا عادی بنا دیا تھا ۔

تعزیوں ۔ پنجوں وغیرہ کے علاوہ بھی مذہب کا اثر زندگی کے دوسرے شعبوں پر پڑا مثلاً ادب ۔ فن تعمیر ۔ موسیقی یہی نہیں بلکہ آداب نشست و برخاست اور غذائیں اور اشیاء خورد و نوش بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ۔ پچھلے باب میں بھی اس کا ذکر آ چکا ہے کہ محرّم میں سوز اور نوحہ خوانی کی وجہ سے موسیقی کو ایک نیا میدان ملا ۔ مجالس کی سرگرمی نے ذوق تعمیر کو بلند سے بلند تر کر دیا ۔ اِمام باڑہ تعمیر کرنے کا شوق عام ہو گیا ۔ تقریباً ہر صاحب حیثیت یہ چاہتا تھا کہ محرم میں اپنے گھر پر بھی مجلس کرے اور لوگوں کے بیٹھنے کے لئے مکان بنائے ۔ امام باڑے کی ساخت اور پختگی کا خیال کر کے لوگ زیادہ سے زیادہ خرچ کر کے خوبصورت عمارت بنواتے ۔ محرم میں اجتماع کا لحاظ رکھ کر صحن اور دالان وسیع رکھواتے تھے ۔ اور اِمام باڑے کو خوب سجاتے تھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعمیراتی ذوق کو بھی اچھا خاصا سہارا مل گیا ۔ یہاں تک کہ تعمیر کا ایک عدیم المثال نمونہ یعنی آصف الدّولہ کا اِمام باڑہ وجود میں آ گیا ۔

محرم اور مجلس کی وجہ سے ہزارون امام باڑے شمالی ہند مین عام طور سے اور اودھ مین خاص طور سے قابل دید نظر آنے لگے ۔ جو اس دور کی ترقی یافتہ تہذیب اور صناعی کی شہادت دیتے ہین ۔

## ملبوسات اور زیورات ۔

جس طرح اور دوسری چیزوں میں ترمیم اور ترقی ہوئی اسی طرح لباس کی تراش و خراش میں بھی طرح طرح کی اختراعات کی گئیں ۔ عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے ۔

" یہ پرانا انگرکھا تھا جو دہلی کے آخری دور میں رواج پا چکا تھا ۔۔۔۔۔۔لکھنؤ میں آنے کے بعد اس انگرکھے میں زیادہ چستی داری پیدا کی گئی بغلوں کی چنٹ بالکل نکل گئی ۔ دامنوں میں بجائے موڑ کے ٹانک دینے کے سنجافی گوٹ لگائی گئی ۔ پھر اس کے بعد نواب زادوں اور شوقین وضعداروں نے اس کمر توڑی کے عوض جز چولی کے نیچے بند لگانے کی جگہ پر ہوتی پلیٹوں کی وضع سے تین تین کمر توڑیاں لگائیں جا بجا کمر توڑیوں کے پاس کٹاؤ کا کام بنایا ۔ دہلی میں انگرکھے کی ایجاد ہونے کے بعد نیمہ چھوٹ گیا تھا ۔۔۔۔۔۔

یہ ہوئی کہ چکن کے نام سے ایک چست قبا
ایجاد ہوئی ۔ اس مین ویسا ہی گول گریبان رکھا
گیا ۔۔۔۔۔سب کے بعد لکھنؤ کے بالکل آخری عہد
مین چکن اور انگرکھے دونون کی ترتیب دینے سے
اچکن ایجاد ہوئی اس مین انگرکھے اور چکن کا سا گریبان
قائم رکھا گیا ۔ اور بیچ سے سیدھا لوٹ کے ادھا
ادھا دونون جانب سی دیا جاتا اور سلائی کی جگہ
پر سنجافی گوٹ کے ذریعہ سے گریبان کی گولائی اور
قطع برقرار رکھی جاتی ۔ بیچ کے چاک مین ۔۔۔۔۔۔۔
بوتام لگا دیئے جاتے وہ بالا بر کی کلی جو اوپر لگائی
جاتی تھی اس مین نیچی کر دی گئی ۔۔۔۔ اچکن کے
نیچے کا حصہ بالکل چکن اور انگرکھے کا سا ہوتا
شوقین لوگ اس مین بھی ویسی زردامن گوٹ اور
اسی طرح کی تین تین کمر توشیان لگاتے اور کٹاؤ کا
کام بناتے "۔

وضع کے لحاظ سے نئی نئی ٹوپیان سرون کی زینت بنتی رہین اور آخر مین
دو پلڑی ٹوپی کو قرار نصیب ہوا اور کسی قدر دیرپا ثابت ہوئی لیکن

شاہی کے آخری دور میں اس ٹوپی کو بھی دوسری ٹوپیوں کی طرح بار سمجھا گیا اور اس کی جگہ ایک نازک سی ٹوپی ایجاد ہوئی جس میں آگے پیچھے دونوں طرف نوک نکلی ہوتی تھی اسی خصوصیت کی وجہ سے یہ نکے دار ٹوپی کہلانے لگی ۔ شہزادے اور امراء اس ٹوپی پر سنہرے روپہلے کا کام بنواکر پہنتے اور عوام بغیر کسی آرائش کے سفید ٹوپی استعمال کرتے ۔

عورتوں کا لباس پہلے تو تنگ مہری کا پائجامہ تنگ استینوں کی چست انگیا اور کرتی کے علاوہ باریک و رنگین چنا ہوا ڈوپٹہ ہوتا تھا ۔ زمانہ جیسے جیسے نفاست اور نمائش کی طرف مائل ہوا ویسے ہی عورتوں کے لباس میں تبدیلی ہوتی گئی ۔ نہایت سبک کپڑوں کی پوشاک پسند کی جانے لگی ساتھ ہی ساتھ ان کی وضع میں بھی تبدیلی ہوگئی ۔ نصر الدین حیدر کے زمانے میں تنگ مہری کے پائجامے ختم ہو گئے اور ان کی جگہ گھیردار پائینچے کے پائجامے زیادہ استعمال ہونے لگے ۔ یہ یہ پائجامے گھیردار کے علاوہ کلی دار بھی ہوتے تھے اور کمر کے پاس کافی تنگ بنائے جاتے تھے ۔

---

سلہ ۔ گزشتہ لکھنؤ ۔ عبدالحلیم شرر ۔ صـــــہ

[1] واجد علی شاہ کے عہد حکومت مین ادھی استینون کا تنگ شلوکا پسند کیا جانے لگا ۔ اس کو محرّم کے اوپر پہنتے تھے ۔ پھر رفتہ رفتہ محرّم کو بھی چھوڑ دیا گیا ۔ مگر بغیر محرم کے عریانی کا اندیشہ ہوا تو پردہ پوشی کے لئے ڈھیلے کرتے کا استعمال مناسب سمجھا گیا اور اس کو پہننے لگین ۔ اس وقت عورتون کے سر پر ڈوپٹہ نہ ہونا بڑا معیوب سمجھا جاتا تھا ۔ کوئی عورت بغیر ڈوپٹہ کے اپنے گھر کے مردون کے سامنے بھی نہین آتی تھی ۔ لیکن سر کا بناؤ سنگار خوب ہوتا تھا ۔ رنگین کپڑون کے موباف سر سے کمر تک لٹکائے جاتے اور کبھی کبھی چوڑا لچکا بھی لگا دیا جاتا تاکہ چوٹی کی دلفریبی مین اضافہ ہو جائے ۔

فسانہ آزاد مین جا بجا ہم کو اس طرح کے لباس نظر آتے ہین ۔ جیسے

" اب سہرا آرا کا حال سنیے ۔ مشروع کا پائجامہ
فوق ابھڑک اسپر بسنت اور گوکھرو کی چمک دمک
ڈوپٹہ پیازی جامدانی کا اور اسپر بیل بوٹے اور
کام کامدانی کا سرمئی گوٹ لیس لگی ہوئی گوری
گوری کلائی چوڑیان سیاہ اور طلائی "[2]

---

[1] ۔ اردو شاعری کا سماجی پس منظر ۔ صفحہ ۲۸۰

[2] ۔ فسانہ آزاد ۔ جلد سوم ۔ صفحہ ۳۳۰

کامدانی کارچوب لچکا پٹھا چٹکی غرض جتنی چیزون عورتون کے کپڑون پر لگائی جاتی تھین ان کا ایک سے ایک اچھا بنانے والا لکھنؤ مین موجود تھا۔ان چیزون کو بنا کر ہزارون گھر اپنے پیٹ بھرتے تھے ۔ کیونکہ یہ مال نہ صرف لکھنؤ ہی مین پسند کیا جاتا تھا بلکہ باہر دور دور تک اس کی مانگ تھی ۔ اور اس کی تیاری مین مرد عورت دونون حصہ لیتے تھے ۔

زیورات مین بھی طرح طرح کے زیور بننے لگے ۔ ان پر نگون کی جڑائی اور کندن کا کام ایسا دلفریب ہوتا تھا کہ دیکھ کر طبیعت خوش ہو جاتی تھی ۔ سب سے بڑی خوبی اُن زیورات کی یہ ہوتی تھی کہ بے حد سبک اور نازک ہوتے تھے ۔سر سے لے کر پاؤن تک کے زیورات مین ہر طرح کے زیور بنائے جاتے ۔ اور ان مین برابر ترمیم بھی ہوتی رہتی تھی ۔ ان زیورون کی خوبصورتی اور نازکی دیکھ کر خود لکھنؤ کے لوگ ہی نہین بلکہ دوسری جگہون کے لوگ بھی ان پر نگاہین نچھاور کرتے تھے ۔

لکھنؤ مین خاص طور پر کندن کا کام بہت اچھا ہوتا تھا ۔ اور اس کام کے کرنے والون مین ایک سے ایک ماہر فنکار موجود تھا ۔ زیورات کی اقسام اور خوبصورتی کا اندازہ فسانہ آزاد کے اس اقتباس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے ۔

" سونے کی پازیب دلفریب ۔ جھاگل اور کڑے ۔
بیڑیان اور چھڑے دسون پیرون مین تلکڑی کے
چھلے پڑے ہوتے ۔ ہاتھون مین چوھے دتیان

کنگن جڑاؤ طلائی کڑے الماس خوانی شمروھان ۔ ھیرے کے
جڑاؤ کڑے ہیڑیان ۔ بازو پر مشعے نو رتن نو نگے اور مرصع
جوشن ۔ گلوئے صفا مین دھدھکی ۔ جھما کلی ۔ تلکڑی
کا طوق چاند سورج لگے ھوئے ۔ اور ان پر یاقوت وزمرد
کی پچی ماری ۔ مالائے مروارید دید نہ شنید ۔ موتیون
کا ھار ۔ جس پر حاصل کان و بحر نثار ۔ ایک ایک موتی
کے بعد زمرد کی خوش رنگ مڑیان ۔ گوش صفا گوش مین
انٹیان اور جھالے اور راج اور بالے ۔ کرن پھول انمول ۔
سر پر چھپکا بیش بہا سیس پھول اور جواھرات کا ٹیکا
مانگ مین موتیون کی لڑی جس پر حوران بہشتی کی نظر
پڑی ------پور پور چھلے ۔ ھیرے اور یاقوت احمر کی
انگوٹھیان دو ایک مین نیشا پوری فیروزے کے نگ تھے ۔
ارسی زیب انگشت ۔ ناک مین نتھ از سرتاپا عالم نور ۔
نظر کا پانون پھسلا جاتا تھا ۔ جواھرات کی چمک دمک
سے گمان ھوتا تھا کہ ایک چاند زمین پر طلوع ھوا "[1]

---

[1] ۔ فسانہ آزاد ۔ جلد سوم ۔ صـ۱۲۴ـــ

غرض یہ کہ اس طرح کے بیسیوں زیور یہ لوگ تیار کیا کرتے تھے ۔
اور روزی کماتے تھے ۔

## " کتابیات "

| نمبر ۔ | کتاب کا نام | مصنف کا نام | طابع | سنہ اشاعت | صفحات |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱ ۔ | اب حیات | شمس العلماء محمد حسین آزاد ۔ | کمال پرنٹنگ پریس مکتبہ اردو اشاعت اردو بازار دہلی | | ٦٨٦ |
| ۲ ۔ | اردو شاعری کا سماجی پس منظر ضمون ۔لکھنؤ کے تمدن و ادب کا جائزہ صفحہ ۲۵۹ | ڈاکٹر اعجاز حسین | نیشنل ارٹ پرنٹرس خوشنویس محمد ابراہیم | ۱۹٦۸ء | ۵۲۴ |
| ۳ ۔ | اردو نثری داستانیں | ڈاکٹر گیان چند جین | انجمن ترقی اردو پاکستان اردو روڈ کراچی | ۱۹۵۴ء | ۱۷ جون ٦۰۸ |
| ۴ ۔ | اردو مرثیہ کا ارتقاء | مسیح الزمان | نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ | ۱۹٦۸ء | پہلی ۵۱۲ |
| ۵ ۔ | امراؤ جان ادا | مرزا ہادی رسوا | علوی پرنٹنگ پریس لاہور | | ۳٦۰ |

| نمبر | کتاب کا نام | مصنف کا نام | طابع | سنہ اشاعت | صفحات |
|---|---|---|---|---|---|
| ٦ ـ | افضل التواریخ | منشی رام سہائے تمنا | تمنائی لکھنؤ | ١٨٦٩ء | |
| ٧ ـ | امجد علی شاہ | سبط محمد نقوی | سرفراز قومی پریس لکھنؤ | ١٩٧٦ء | |
| ٨ ـ | انقلاب ١٨٥٧ء | پی ـ جی ـ جوشی | نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نئی دہلی | ١٩٧٢ | |
| ٩ ـ | ایسٹ انڈیا کمپنی اور ہندی علماء | مفتی انتظام اللہ شہابی | دہلی بکڈپو اردو بازار دہلی | | |
| ١٠ ـ | بیگمات اودھ | شیخ تصدق حسین | سرفراز قومی پریس لکھنؤ | | |
| ١١ ـ | تاریخ اودھ جلد ٥ | نجم الغنی محمد | نول کشور پریس لکھنؤ | ١٩١٩ء | |
| ١٢ ـ | تحقیقات مجموعہ مضامین | عندلیب شادانی | | | |
| ١٣ ـ | تنقیدیں | خورشید الاسلام | اسرار کریمی پریس الہ آباد اول ١٩٥٧ء دوم ١٩٦٢ء | | |
| ١٤ ـ | تاریخ لکھنؤ | مولانا سید آغا مہدی لکھنوی | ناشر جمعیتہ خدام عزا کراچی | | |

| نمبر ۔ | کتاب کا نام | مصنف کا نام | طابع | سنہ اشاعت | صفحات |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱۵ ۔ | تاریخی شہ پارے | مرزا علی اظہر برلاس | ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس کراچی | ۱۹۷۱ء | |
| ۱۶ ۔ | تحقیقی جائزے | ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری | سرفراز قومی پریس لکھنؤ | ۱۹۶۸ء | |
| ۱۷ ۔ | تاریخ اصفی | ترتیب و ترجمہ ڈاکٹر ثروت علی | جمال پرنٹنگ پریس لکھنؤ | ۱۹۶۸ء | |
| ۱۸ ۔ | تاجدار اودھ | امجد علی خان | الواعظ پریس لکھنؤ | ۱۹۷۶ء | |
| ۱۹ ۔ | خوجی | احسن فاروقی | | | |
| ۲۰ ۔ | جان عالم | مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی | ادارہ فروغ اردو لاہور | | |
| ۲۱ ۔ | داستان تاریخ اردو | حامد حسن قادری | عزیزی پریس آگرہ | ۱۹۵۷ء | |
| ۲۲ ۔ | داستان سے افسانہ تک ۔ | وقار عظیم | یونین پرنٹنگ پریس دہلی ۔ جدید پرنٹنگ پریس دہلی | مارچ ۱۹۶۶ء | |
| ۲۳ ۔ | دلی کا دبستان شاعری | ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی | سرفراز پریس لکھنؤ | دوم ۱۹۶۵ء | |
| ۲۴ ۔ | سرشار ایک مطالعہ | پریم پال اشک | یونین پرنٹنگ پریس دہلی | اول ۱۹۶۴ء | |

| نمبر ـ | کتاب کا نام | مصنف کا نام | طابع | سنہ اشاعت | صفحات |
|---|---|---|---|---|---|
| ۲۵ ـ | سرشار کا اردو ادب میں | عبد اللطیف | | | |
| | مرتبہ | | | | |
| ۲۶ ـ | سلطان عالم واجد علی | پروفیسر مسعود | نامی پریس | | |
| | شاہ اختر | حسن رضوی ادیب | لکھنؤ | | |
| ۲۷ ـ | فسانہ عبرت | مرزا رجب علی بیگ | تنظیم پریس | | |
| | | مرتبہ سید مسعود سرور | لکھنؤ | | |
| | | حسن رضوی ادیب | | | |
| ۲۸ ـ | فسانہ آزاد جلد چار | رتن ناتھ سرشار | لیبرٹی آرٹ پریس | جولائی ۱۹۷۰ء | |
| | | | دریا گنج دہلی | | |
| ۲۹ ـ | قیصر التواریخ | سید کمال الدین | منشی نول کشور | ۱۸۹۶ء | |
| | | حیدر | لکھنؤ | | |
| ۳۰ ـ | گل رعنا | عبد الحی | معارف اعظم گڑھ | ۱۲۴۳ء | |
| ۳۱ ـ | گزشتہ لکھنؤ | مولانا عبد الحلیم | نظامی پریس | ۱۹۷۴ء | |
| | | شرر لکھنوی | لکھنؤ | | |
| ۳۲ ـ | لکھنؤ کا شاہی اسٹیج | پروفیسر سید مسعود | کتاب نگر دین دیال | | |
| | | حسن رضوی ادیب | روڈ ـ لکھنؤ | | |
| ۳۳ ـ | لکھنؤ کی تہذیبی میراث | ڈاکٹر سید صفدر حسین | بارگاہ ادب لاہور | ۱۹۷۵ء | |
| ۳۴ ـ | لکھنؤ کا دبستان | ڈاکٹر ابو لیث | اردو پبلشر | | |
| | شاعری | صدیقی | لکھنؤ | | |

| نمبر۔ | کتاب کا نام | مصنف کا نام | طابع | سنہ اشاعت | صفحات |
|---|---|---|---|---|---|
| ۳۵ ۔ | لکھنؤ اور جنگ آزادی | ادبی اکیڈمی لکھنؤ | سرفراز قومی پریس لکھنؤ | ۱۹۵۷ء | |
| ۳۶ ۔ | لکھنؤ کی زبان | محمد باقر شمس لکھنوی | جمال پرنٹنگ پریس دہلی | ۱۹۶۹ء | |
| ۳۷ ۔ | میر تقی میر حیات اور شاعری | ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی | | | |
| ۳۸ ۔ | نقد سرشار | تبسم کاشمیری | اشراف پریس لکھنؤ | اول جنوری ۱۹۶۲ء | |
| ۳۹ ۔ | واجد علی شاہ | ڈاکٹر محمد تقی احمد | نظامی پریس لکھنؤ | ۱۹۷۵ء | |
| ۴۰ ۔ | واجد علی شاہ اور ان کا عہد | رئیس احمد جعفری | | | |

## ہندی کتابیات

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱ ۔ | اودھ کی لوٹ | مترجمہ راجیندر پانڈے | بھارگو بھوشن پریس بنارس | ۱۹۶۶ء | |
| ۲ ۔ | بھارت میں انگریزی راج جلد اول ۔ دوم | پنڈت سندر لال | پرکاش وبھاگ بھارت سرکار | ۱۹۶۷ء | |

## انگریزی کتابیات

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱ ۔ | لکھنؤ پاسٹ اینڈ پریزنٹ | اکرام الدین قدوائی ایم اے | | | |

| نمبر۔ | کتاب کا نام | مصنف کا نام | طابع | سنہ اشاعت | صفحات |
|---|---|---|---|---|---|
| ۲ ۔ | ہسٹری اف انڈیا | جیمس۔ایم۔جینے ایس۔جے۔ | میک من اینڈ کمپنی۔بمبئی | ۱۹۶۲ء | |

## رسائل

| ۱۔ | رسالہ کا نام | ایڈیٹر | مضمون | مصنف کا نام | سنہ اشاعت |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱ ۔ | ادیب۔علی گڑھ | قمر رئیس | فسانہ آزاد ایک مطالعہ | ڈاکٹر سید محمد طفیل | |
| ۲ ۔ | نیا دور۔لکھنؤ | | لکھنؤ کے میلے | گوپی ناتھ نارنگ | ۱۸۷۹ء |
| ۳ ۔ | آج کل۔نئی دہلی | شہباز حسین | لکھنؤ اور دلی کے بانکے | غلام احمد فرحت | اپریل ۱۹۵۱ |
| ۴ ۔ | ادبی دنیا | | لکھنؤ اور سرشار | | فروری ۱۹۴۵ |